ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

نومبر ۲۰۱۹ء | جلد ۱۱ | شمارہ ۵ | ربیع الاول ۱۴۴۱ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی
(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مجلس مشاورت

- مولانا سید سلمان الحسینی ندوی
- مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
- مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
- ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
- محمد قمر عالم لکھنوی
- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی
- مولانا محمد اخلاق ندوی

مدیر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی
tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

معاون مدیر

محمد فرید حبیب ندوی

مجلس ادارت

- پروفیسر مسعود خالد علیگ
- مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
- محمد قمر الزماں ندوی

سرکولیشن انچارج

سعید احمد انصاری 9045616218
محمد آصف اقبال ندوی 9454210673

شرح خریداری

فی شمارہ: 25:00روپے
سالانہ: 250:00روپے
سالانہ اعزازی ممبرشپ: 500:00روپے
بیرونی ممالک: 30$ ڈالر
لائف ممبرشپ (۲۰ سال): 4000:00روپے

Bank Acount Detail: Mr Saeed Ahmad Ansari
Acount No: 6561000100039197
IFSC code: PUNB0656100
Punjab National Bank, Medical Road, Aligarh-202002
Mob. 9808850029

خط و کتابت کا پتہ:

مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر ڈی، کوارسی بائی پاس، علی گڑھ
e-mail: nidaeaetidal@gmail.com

Designed and composed by Abdullah Maroofi, Mob. 8218439622; email-almarufi.abdullah369@gmail.com

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹر پرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی، علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at Ideal Graphics Enterprises, Patwari Nagla, Aligarh

visit us: www.nadwifoundationaligarh.org

فہرست مضامین

۱-	قرآن کا پیغام	بدخواہی کا انجام	محمد عارف ندوی	
۲-	اداریہ	انصاف تو جمہوریت کی بھینٹ چڑھ گیا.....	مدیر	۳
۳-	خاص تحریر	عالم عربی کی صورت حال-احادیث کی روشنی میں (۳)	مجیب الرحمٰن عتیق ندوی	۱۰
۴-	تاریخ کے جھروکوں سے	''ہندوستان کے-مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری''	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۲۳
۵-	خطبات	خطبۂ حجۃ الوداع	قمر الزماں ندوی	۳۶
۶-	تعلیم و تربیت	تربیت اولاد- چند اہم گوشے	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۳۹
۷-	مطالعات	علم کلام میں غور وخوض کی ضرورت	امانت علی قاسمی	۴۲
۸-	// //	داراشکوہ اور اس کی تصانیف کی عصری معنویت	ڈاکٹر محمد حبیب	۴۶
۹-	نقطۂ نظر	داراشکوہ سنگھیوں کا محبوب کیوں؟	محمد اسامہ فلاحی	۵۱
۱۰-	نظریۂ جہاد	جنگ سے متعلق عام موقف	ترجمہ: محمد سہیل ندوی	۵۶
۱۱-	اصلاح حیات	مسلمان اغیار کی نقالی سے بچیں	عبدالرشید طلحہ نعمانی	۶۱
۱۲-	تعارف و تبصرہ	''پیامِ سیرت''	نایاب حسن قاسمی	۶۴
۱۳-	شعر و ادب	قطعۂ تاریخ وفات	ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی	

❋❋❋

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

انصاف تو جمہوریت کی بھینٹ چڑھ گیا
مگر اب ہم کو کیا کرنا چاہیے

بہت پرانی کہاوت ہے کہ ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' اس وقت بابری مسجد کا جو فیصلہ آیا اس نے ایک بار پھر اسی حقیقت کو واشگاف بیان کیا کہ جمہوریت میں اکثریت کو طاقت حاصل ہوتی ہے، اکثریت کی رضا اور ناراضگی کا بھرپور خیال رکھا جاتا ہے، اس کی دلچسپیاں بدلتی رہتی ہیں، اسی اعتبار سے قانون بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں، اس وقت ملک کی زمام اقتدار جس کے ہاتھ میں ہے اس کی دلچسپی یونیفارم سول کوڈ میں ہے، ہندو راشٹر کے قیام میں ہے، اس کی دلچسپی مذہبی جذبات کی تجارت میں ہے، ملک کے ایک بڑے طبقہ کو دبانے اور بے دست و پا کرنے میں ہے، اس کی دلچسپی سارے ملک کو دیوالیہ کر کے ایک چھوٹے سے مخصوص حلقہ کو با اختیار بنانے میں ہے، اس کی دلچسپی انتقام لینے میں ہے، اس کی دلچسپی مسلمانوں کو دوسرے درجہ کا شہری بنانے میں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس ملک کا مزاج سمجھنے میں ہم سے غلطی ہوئی ہے، جس کے نتیجہ میں حکمت عملی بھی غلط اختیار کی گئی اور کرنے کا اصل کام بھی نہ کے برابر کیا گیا، غیر مسلموں سے رابطہ مضبوط کرنے کے لیے لسان قوم کے حامل علماء بھی تیار نہ کیے گئے، اشاعت اسلام کی ذمہ داری نبھانے کا جس طرح استحقاق تھا اس طرح نہ نبھائی گئی، حفاظت اسلام کی تمام تر کوششیں صرف اپنوں کی تخریبی کوششوں یا نظریاتی اختلافات کی تردید تک محدود ہوگئیں، مسلم دور حکومت میں اگر یہ کام بڑے پیمانے پر نہیں ہوا تھا تو آزاد بھارت میں یہی کام سب سے ضروری تھا، مگر افسوس کہ نہ انسانی بنیادوں پر غیر مسلموں سے مضبوط تعلقات استوار کیے گئے، نہ دعوت کا فریضہ ہی انجام دیا گیا، طاقت کے عدم توازن کے باوجود دماغ کی طاقت سے شہ مات کا کھیل کھیلنے کے بجائے کانگریس کا بوجھ ڈھویا گیا اور کانگریس کی وجہ سے ہی ٹکراؤ کی پالیسی اختیار کی گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ آج ہم جس مقام پر پہنچ گئے شاید بہت سے لوگوں کے ذہن میں یہاں تک پہنچنے کا کبھی خیال بھی نہ آیا ہوگا، بہت سے لوگوں نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ اچانک اس ملک میں یہ حالات پیدا ہوں گے، اس پر مستزاد افسوسناک صورت حال یہ ہے کہ جس قدر حالات سخت ہوتے جارہے ہیں اسی قدر ہمارا ملی انتشار بڑھتا جارہا ہے، انتشار میں اضافہ کی کوشش سبھی کی ہے مگر منتشر صورت حال پر قابو پانے کی خواہش تقریباً کسی میں نہیں۔

جہاں تک بابری مسجد پر آئے فیصلہ کا معاملہ ہے تو اس فیصلہ کا تجزیہ تحصیل حاصل کے سوا کچھ نہیں، بہت سے لوگ یہ کام کر چکے اور بہت سے کر رہے ہیں، معاملہ صرف اس فیصلے میں موجود جھول اور ناانصافی کا نہیں، بلکہ مسئلہ اس ملک میں ہمارے تشخص اور اب تو ہمارے وجود کا ہے، شہریت پر سوالیہ نشان ہے، معاملہ مسجد کے ساتھ ہماری پوری مسلم تاریخ اور اس تاریخ سے

جڑی ہماری نسبت وعظمت کا ہے، سب سے اہم بات جو سمجھنے کی ہے اور جذباتیت سے اوپر اٹھ کر سمجھنے کی ہے، کہ اس فیصلے کے ساتھ آپ صرف مسجد کا مقدمہ نہیں ہارے بلکہ اپنا ملک، وطنیت اور اعتماد کو ہار گئے، مسلمانوں کے تئیں اعتماد وانصاف کا اس فیصلے نے مکمل طور پر خون کر دیا، جس ملک میں ہماری مکمل حصہ داری تھی وہاں ہماری شہریت چھیننے کی تیاری کی جانے لگی، فیصلہ کا طائرانہ مطالعہ بھی آپ کو بتا دے گا کہ یہ فیصلہ نہیں بلکہ مسئلہ کو حل کرنے کا ایک سوچا سمجھا پلان ہے، اس کی ابتدا میرے اندازے کے مطابق سپریم کورٹ کے ججز کی اس پریس کانفرنس سے ہوئی تھی جس میں اِس وقت کے چیف جسٹس بھی موجود تھے، جن کی ساکھ اُس وقت حکمراں جماعت کے مخالف اور جمہوریت پسند شخصیت کی بنی تھی، پھر اس کے ایک موقع وہ آیا جب چیف جسٹس کو جنسی استحصال (Sexual Harassment) کے کیس میں پھنسایا گیا، پھر اس کا تصفیہ ہوا، اس کے بعد ایک مصالحتی کمیٹی بنائی گئی جو میرے خیال میں ملک اور بالخصوص مسلمانوں کا بخار ناپنے کا کام کر رہی تھی اور اس نے بخار ناپ کر اپنی رپورٹ پیش کر دی، اس کی دلیل یہ ہے کہ فیصلہ آنے سے قبل مظلوموں سے ہی نہ تڑپنے کی اپیلیں کی جانے لگیں، ایسا لگتا ہے کہ فیصلہ لوگوں پر منکشف تھا اسی لیے آر ایس ایس نے جشن نہ منانے کی اپیل بھی جاری کر دی، واقعہ یہ ہے کہ اس موقع پر جشن منا کر ہندوتوا کا کارڈ کھیلا جا سکتا تھا مگر شاید عالمی منظر نامہ پر بگڑتی شبیہ کے پیش نظر اس سے گریز کیا گیا۔ پروفیسر فیضان مصطفیٰ جو ایک بڑے ماہر قانون ہیں، جن کی بہت سی باتوں کو اس فیصلہ میں لکھا گیا ہے جو کہ پہلے ہی وہ اپنی ویڈیوز میں کہہ چکے تھے، انھوں نے دو جملوں میں ساری بات کہہ دی، انھوں نے کہا کہ ''یہ فیصلہ قانون کو بیان کرنے میں تو بہت مؤثر ہے مگر قانون کے نفاذ میں انتہائی غیر مؤثر، مزید انھوں نے کہا کہ یہ فیصلہ نہیں بلکہ مسئلہ کا حل پیش کیا گیا ہے، شاید ججوں کے ذہن میں یہ بات رہی ہو کہ اس کے علاوہ کوئی فیصلہ اس مسئلہ کو حل نہ کر سکے گا''، راقم فیضان صاحب سے آگے بڑھ کر یہ کہتا ہے کہ یہ محض حل نہیں بلکہ ''سیاسی حل'' ہے جس میں کسی ریویو کی گنجائش نہیں، ہم نے جب سے ہوش سنبھالا صرف ایک ہی بات سنی کہ ''ہم عدالت پر مکمل اعتماد کرتے ہیں''، ''عدالت کا جو بھی فیصلہ آئے گا ہم اسے مانیں گے''، کس عدالت کا فیصلہ؟ جمہوری طرز حکومت ہو یا کوئی اور طرز، طاقت کے دباؤ میں کون نہیں رہتا، دنیا کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوا ہوگا مگر ہمارے ملک میں ہوا کہ آدھی رات کو عدالت کھلی اور معاملہ کی سماعت کر کے فیصلہ کر دیا گیا، جسٹس لویا کے معاملہ میں عدالت کا کیا رخ رہا؟ سبری مالا مندر پر عدالت نے فیصلہ سنایا تو ملک کے وزیر داخلہ نے کہا کہ ''عدالت عظمیٰ ایسے فیصلے نہ صادر کرے جن کا نفاذ نہ ہو سکے''، عدالت اپنے فیصلوں میں قوت نافذہ کی محتاج ہے، قوت نافذہ ہر حال میں موثر ہوتی ہے، اتراکھنڈ میں میڈیکل کی فیس بڑھانے کا ظالمانہ فیصلہ کیا گیا، طلبہ نے احتجاج کیا، کورٹ نے طلبہ کے حق میں فیصلہ سنا دیا مگر ۴۵ر دن سے احتجاج جاری بھی ہے اور حکومت اپنے فیصلے پر قائم بھی ہے، عدالتوں کی صورت حال اور جمہوری حکومت کا رویہ، ہمارے دوست ڈاکٹر عمیر انس کی بات بہت قابل غور ہے جو اس موقع پر انھوں نے اپنے حقیقت پسندانہ تجزیاتی مضمون میں لکھی: ''مسلمان ایک ایسے قانونی فریق ہیں جن کے موقف کے خلاف ریاست، سیاسی ماحول، میڈیا، سیاسی جماعتیں اور سیکورٹی ایجنسیاں اور ان کے بیشتر ہم خیال افراد، مسلمان اس ملک میں اپنا مقدمہ عوام کی عدالت میں بہت پہلے ہی ہار چکے ہیں، اس ملک میں رائے عامہ کنٹرول کرنے والی پوری مشین مسلمانوں کے موقف سے ہمدردی نہیں رکھتی، اخبارات، ٹیلی ویژن، فلمیں، جلسے جلوس، سیمینار اور علمی مذاکرے سبھی جگہوں سے مسلمانوں کا موقف رکھنے اور سننے کے مواقع پر تقریباً ختم ہو چکے ہیں، یہ سب ایک دن میں نہیں ہوا ہے، مسلمان ایک ایسے ملک میں قانونی چارہ جوئی کرتے ہیں جہاں ہوا کا

رخ ہمیشہ ہی ان کے خلاف بنا دیا جاتا ہے''، جولوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس قانونی چارہ جوئی کے بعد آئے اس فیصلے سے ملک میں ہجومی بالادستی نہ قائم ہوسکی، انھیں اس پہلو سے بھی غور کرنا چاہیے کہ'' قانون وانصاف کے مندر'' کے ذریعہ ہی ہجومی بالادستی کو سند عطا کردی گئی، پروفیسر اپوروانند نے اس فیصلے کو ۶؍دسمبر ۱۹۹۲ء کے واقعہ کے مثل ایک واقعہ قرار دیا ہے، دونوں ہی واقعات کا نتیجہ ہجومی بالادستی ہے اگرچہ ایک کو کورٹ نے خود غیر قانونی قرار دیا ہے اور دوسرے کو خود ہی سند عطا کی ہے، کیونکہ جب فیصلہ ثبوت وشواہد سے قطع نظر آستھا کی بنیاد پر ہو تو پھر سوائے ہجومی بالادستی کے اور کیا ہے؟ کورٹ نے تسلیم کیا ہے کہ اس کے قطعی ثبوت نہیں ملتے کہ متنازع زمین ہی رام جی کی جائے پیدائش ہے مگر پھر بھی پوری زمین اکثریتی طبقہ کو اس بنیاد پر دے دی گئی کہ بقول ان کے وہ بھی وہاں سینکڑوں سال سے پوجا کرتے آئے ہیں، حالانکہ ہندوؤں کا دعوی رام چبوترے پر تھا جو مسجد سے ۸۰؍فٹ دور تھا، جبکہ مسجد میں ہندوؤں نے چوری یا زبردستی سے مورتی ۱۹۴۹ء میں رکھیں، اور پھر اس کو عقیدے کا حصہ بنالیا کہ '' بھگوان رام کی مورتی پرکٹ ہوئی''، کورٹ نے اسی آستھا کی بنیاد پر جب متنازع زمین ہندو فریق کو دے دی تو ۵؍ایکڑ زمین ایکوائر اراضی یا دوسری زمین مسلمانوں کو دینے کا حکم دیا۔

اس میں کسے شک کہ بابری مسجد ایک مسجد تھی، ہمارے دل ودماغ میں اس کی کسک ہمیشہ باقی رہے گی کہ وہ ایک مسجد جسے تھی ظالمانہ طریقہ سے شہید کیا گیا پھر قانون کے ذریعہ اس پر غاصبانہ قبضہ کرلیا گیا، مگر اس غم واندوہ اور تکلیف دہ کارروائی سے قطع نظر ہم کو اب اس ملک میں اپنے مستقبل اور دیگر مساجد ومدارس کے متعلق سوچنا چاہیے، خود اس غیر منصفانہ فیصلے میں ایسے مثبت پہلو موجود ہیں جن کے ذریعہ ایک نئی شروعات کی جاسکتی ہے، بابری مسجد جب تک کھڑی تھی تب تک بہت کچھ امیدیں کی جاسکتی تھیں، حالانکہ وہ بھی موہوم تھیں، اس لیے کہ ۱۹۴۹ء میں جب مورتیاں رکھی گئیں تو ملک کو آزاد کرانے والی قد آور مسلم شخصیات حکومتِ وقت کا حصہ تھیں، مگر آر ایس ایس اس وقت تک اتنی طاقتور ہوچکی تھی کہ وہ شخصیات اس مسئلہ میں غیر مؤثر ثابت ہوئیں، تقریباً ۱۱؍سال تک مسلمان کانگریس کی نیک نیتی کی امید میں خاموش رہے، اس کے بعد مقدمہ دائر کیا گیا، بہرحال پھر بھی امیدیں قائم تھیں مگر ۱۹۹۲ء میں مرکزی وصوبائی حکومت کی سرپرستی ونگرانی میں انتہائی بے رحمی کے ساتھ مسجد شہید کی گئی اور اس کی جگہ پر ایک عارضی مندر قائم کردیا گیا، اس کے بعد مسجد کی بازیابی کی امیدیں ختم ہوگئیں، مگر جہاں تک کوششیں کی جاسکتی تھیں وہاں تک کی گئیں اور یہی ہمارا فرض بھی تھا، ملی تنظیموں نے اپنے بس بھر ذمہ داری نبھائی اور تمام تر ثبوت وشواہد مستعدی کے ساتھ جمع کر کے پیش کیا، یہ کہا جاسکتا ہے کہ'' مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا''، بابری مسجد پر جس قدر سیاست کی گئی شاید کسی اور مسئلہ پر آزاد بھارت کی تاریخ میں نہیں کی گئی، ان سارے سیاست بازوں کے نام تاریخ میں محفوظ ہوگئے، خواہ ان کا تعلق کسی فریق اور کسی بھی مذہب سے ہو، بابری مسجد کو اس حال تک پہنچانے کا سہرا کانگریس کے سر ہے، اور ہماری یہ غلطی ہے کہ پھر بھی ہم کانگریس کو نہ سمجھ سکے، بی جے پی نے بہت بعد میں رام مندر کارڈ کھیلا، اور اسی کے جواب میں راجیو گاندھی نے شیلا نیاس کرایا اور تالا کھلوایا، بہرحال بی جے پی بالآخر جیت گئی اور کانگریس ہار گئی، اس طور پر کہ سپریم کورٹ نے اس کو ٹرسٹ بنانے کا حکم دے کر رام مندر بنانے کا کریڈٹ لینے اور اپنے انتخابی منشور میں کیے گئے وعدے کو پورا کرنے کا پورا موقع فراہم کیا، بابری مسجد جب تک موجود تھی تب تک اس مسئلہ کو حل کرنے کے متعدد طریقے ہوسکتے تھے، ایک طریقہ حضرت مفکر اسلامؒ نے اپنایا تھا مگر افسوس کہ جذباتیت اور سیاست نے حضرت مولانا کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا، ان کو ملت فروش، گمراہ اور کافر تک کہا گیا، ورنہ شاید مسجد بھی

موجود رہتی، نماز بھی ہوتی اور مندر کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا، مولانا نے بڑے درد کے ساتھ اس جذباتیت کا جا بجا شکوہ کیا ہے۔

بابری مسجد جب شہید کر دی گئی اور وہاں عارضی مندر بنا دیا گیا تو اب اس کی وہاں از سر نو تعمیر کا صرف ایک ہی طریقہ سمجھ میں آتا ہے کہ خلافت اسلامیہ قائم ہو جائے، یا اللہ کی طرف سے کوئی معجزہ ہو جائے ورنہ اس ہندو اکثریتی ملک کی جمہوریت میں بظاہر یہ کام ممکن نہیں، ملک کی عدلیہ سے منصفانہ فیصلہ اگر صادر بھی ہو جاتا تو بھی وہاں مسجد کا بننا تو دور، جو عارضی مندر ہے اس کا ہٹنا بھی ممکن نہ ہوتا، لیکن اس کے باوجود یہ صحیح ہے کہ جو راستہ اختیار کرنے کے ہم مکلّف ہو سکتے تھے وہ راستہ ہم نے اختیار کیا، اس میں کوئی شک نہیں کہ بابری مسجد اور رام مندر کے مسئلہ کو آستھا سے زیادہ سیاسی ایشو بنا دیا گیا اور اس سلسلہ میں افہام وتفہیم کی کوششیں جس طرح ہونی چاہیے نہ ہوئیں، کیونکہ افہام وتفہیم اور صلح ومصالحت کی کوششیں تب ہی کامیاب ہوتی ہیں جب وہ دانشمندانہ اور اجتماعی ہوں اور ان میں گنجائشیں نکالنے پر غور ہو، گنجائشیں تلاش کرنے کے لیے ماہرین کی اجتہادی کوششوں کو بڑا دخل ہوتا ہے، یہ حقیقت ہے کہ انفرادی کوششیں نہ قبول کی جاتی ہیں اور نہ مؤثر ہوتی ہیں، انفرادی کوششوں کی حیثیت محض ایک شخصی رائے کی ہوتی ہے، رائے دینے کا سب کو حق ہے، مگر فرد کو یا افراد کو اپنی رائے معروضی انداز میں پیش کرنے تک ہی محدود رکھنے میں ملت کی عافیت ہوتی ہے۔ بابری مسجد کی شہادت کے بعد بھی ایسے بہت سے طریقے ہو سکتے تھے جن کی بدولت مسجد کی زمین کا مسئلہ اس طور پر حل کیا جا سکتا تھا کہ وہ نہ ہندو کی رہتی نہ مسلمان کی مگر افسوس کہ اس جانب بھی سنجیدہ پیش رفت نہ ہو سکی، اس کے بالمقابل ہندوؤں نے اپنی تمام تر طاقت کے باوجود دماغ کا کھیل بھی کھیلا اور بالآخر وہ اس دماغی داؤ پیچ میں قانون کا سہارا لے کر جیت گئے، اب اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہم مخلصانہ طور پر اپنا احتساب کریں اور ماضی کی غلطیوں سے سیکھ کر مستقبل کا فیصلہ کریں۔

بہر حال اب تو جو ہونا تھا وہ ہو چکا، اب ہم کو کیا کرنا چاہیے، ایک رخ تو وہ تھا جو سبری مالا مندر پر فیصلہ کے بعد ہندوؤں نے اپنایا اور اپنا احتجاج درج کرایا، ظاہر ہے کہ ہونا یہی چاہیے تھا، کیونکہ جمہوریت میں یہ ہمارا دستوری حق ہے اور جمہوریت میں یہی طریقہ موثر وکارگر بھی ہوتا ہے بشرطیکہ مخلصانہ اور غیر سیاسی طور پر اسے انجام دیا جائے، لیکن ملک کی موجودہ صورت حال میں مسلمانوں کے لیے یہ فیصلہ یقیناً غیر دانشمندانہ ہوتا، بالکل ویسا ہی غیر دانشمندانہ جیسے کسی کا یہ ٹوئیٹ کہ ''ہم کو ہماری مسجد واپس چاہیے''، ظاہر ہے کہ ہم ماتم کر سکتے ہیں، ہم فیصلے کے غیر منصفانہ پہلوؤں کو واضح کر سکتے ہیں اور یہ کام کیا گیا مارکنڈے کاٹجو، جسٹس گانگولی، پروفیسر فیضان مصطفیٰ اور بہت سارے لوگوں نے یہ کام انجام دیا اور اپنے اپنے انداز میں تنقیدیں بھی کیں، دوسرا کام یہ ہو سکتا تھا کہ ہم اس فیصلے کے مثبت پہلوؤں سے فائدہ اٹھاتے، اس ملک میں ہمارے خلاف یہ فضا بنائی گئی اور زہر گھولا گیا کہ بابر نے مندر کو توڑ کر مسجد بنایا، یہ وہ بات ہے جس نے پورے ملک میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کا ماحول گرم کر دیا، دوریاں پیدا کر دیں، ہماری مسجدوں کو نفرت کی علامت بنا دیا، مگر اب سپریم کورٹ نے یہ داغ دھو دیا اور صاف کہہ دیا کہ اس کے کوئی ثبوت نہیں ملتے کی مندر توڑ کر مسجد بنائی گئی، یہ بھی واضح کر دیا کہ اے ایس آئی کی جس رپورٹ میں کھدائی میں کچھ آثار ملتے ہیں وہ مسجد کے تو نہیں ہیں مگر یہ بھی واضح نہیں کہ وہ کسی مندر کے ہیں یا نہیں، اور پھر وہ آثار بارہویں صدی کے معلوم ہوتے ہیں جبکہ مسجد ۱۵۲۸ء میں تعمیر کی گئی، کورٹ نے یہ بھی تسلیم کیا کہ کم از کم ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۹ء تک اس میں نماز ہوتی تھی گویا وہ ایک آباد مسجد تھی، کورٹ نے مورتیاں رکھنے کے عمل کو غیر قانونی اور مجرمانہ عمل قرار دیا، یہی نہیں بلکہ ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء کی دہشت

گردانہ، ظالمانہ اور غیر جمہوری کارروائی کو بھی مجرمانہ اور غیر قانونی عمل قرار دیا۔ ۱۹۹۱ء کے اس ایکٹ کی مزید توثیق کردی کہ ۱۹۴۷ء تک جو عبادت گاہ جس حال میں تھی وہ اسی حال میں باقی رہے گی، اگرچہ بابری مسجد کا قضیہ اس سے الگ رکھا گیا، اتنے حقائق تسلیم کرنے اور خود ہی یہ کہنے کے بعد کہ کورٹ آستھا پر فیصلہ نہیں کرے گی مگر بالآخر فیصلہ آستھا کے مطابق کردیا اور یہ کہہ دیا کہ مسلمان اپنا حق ملکیت ثابت کرنے میں ناکام رہے، اب اس کے بعد ہونا یہ چاہیے تھا کہ پورے ملک کے عوام کو فیصلے کے تضادات اور ان پہلوؤں سے واقف کرایا جاتا، جو داغ ہمارے اوپر سے سپریم کورٹ نے دھوئے ہیں، ان سے برادران وطن کو واقف کرایا جاتا اور بتایا جاتا کہ دیکھو سیاسی بازیگروں نے جھوٹ بول کر کس طرح ہندو مسلم فسادات کرائے، آج سپریم کورٹ نے ان کے جھوٹ کو جھوٹ قرار دے دیا، رتھ یاترا ہو یا کارسیوا اور اس کے بعد کی کارروائی اس کو غیر قانونی فعل قرار دے دیا، چونکہ ہم تضادات اور ناانصافی کے باوجود اس عدالتی فیصلے کے احترام میں اپنے جذبات دباتے تو انھیں بھی ان حقائق پر چُوں کرنے کی مجال نہ ہوتی جن کو خود عدالت نے تسلیم کیا، بقول مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی صاحب اس طرح رابطہ کی ایک نئی مہم شروع ہوسکتی تھی، سیاسی بازیگری کو شکست دی جاسکتی تھی، اپنی مظلومیت کو دنیا کے سامنے بالخصوص اس ملک کے منصف مزاج لوگوں کے سامنے پیش کیا جاسکتا تھا بلکہ ان انصاف پسند ہندوؤں کو استعمال کیا جاسکتا تھا جو از خود اس فیصلے پر تنقیدیں کر رہے تھے، ان مثبت پہلوؤں کی مدد سے مسلمانوں کے حق میں بالخصوص دعوتی کام کے لیے ایک ماحول تیار کیا جاسکتا تھا، ہم کمزور و مجبور ہیں، کمزوری و مجبوری میں ہمارا صرف ایک ہتھیار ہے دعوت، چونکہ مکرمہ میں بھی یہی ہتھیار تھا، مگر افسوس کہ اس بنیادی ضرورت و فریضہ کی طرف ہمارا ذہن ہی نہیں جاتا کہ ہم پہلے رابطے بڑھانے کی کوشش کریں، انسانی بنیادوں پر کام کرکے مؤثر بنیں اور دعوت کی راہ ہموار کریں، اس کے برخلاف فیصلہ آتے ہی قوم غیر ضروری بحثوں میں الجھ گئی، فیصلہ غیر منصفانہ تھا مگر فیصلہ کے بعد ہمارا منظر نامہ مزید غیر منصفانہ رہا۔

ریویو پٹیشن اور ۵/ایکڑ زمین لی جائے یا نہ لی جائے اس کا فیصلہ ملی تنظیموں اور مسلم قیادت کو کرنا ہے اور وہی آخری اور اجتماعی فیصلہ بھی ہوگا اور ہم سب کی تائید بھی اسی کو حاصل ہوگی، (یہ مضمون لکھا جاچکا تھا، لیکن اس کے بعد معلوم ہوا کہ اگرچہ بہت سے لوگ ریویو کے حق میں نہیں تھے، مگر اجتماعی قیادت نے ریویو کے لیے عرضی دائر کرنے کا فیصلہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ خیر مقدر فرمائے) مگر ہمارا نظریہ یہ ہے کہ سپریم کورٹ کے اس ''انوکھے'' فیصلے کے خلاف جس میں یہ تک ظاہر نہیں ہوتا کہ کون سا صفحہ اور کون سا پیراگراف کس جج نے لکھا ہے ریویو پٹیشن بے سود ہوگی، جبکہ ایسا کبھی نہیں ہوتا فیصلہ لکھنے والے جج کا نام ہی نہ مذکور ہو، ہوسکتا ہے کہ یہ خارج کردی جائے، اور اگر قبول کرلی گئی تو بھی فیصلے میں کسی تبدیلی کا اس فسطائی جمہوریت میں امکان نہیں ہے، کیونکہ اس کا فیصلہ جب بھی آئے گا تو کچھ اسی طرح کا آئے گا، کانگریس کی حکومت میں الہ آباد ہائی کورٹ نے ایک تہائی زمین دے دی تھی، سپریم کورٹ نے بی جے پی حکومت میں فیصلہ دیا تو وہ بھی واپس لے لی، البتہ اتنا خیال رکھا کہ وہاں سے دور ۵/ایکڑ دے دیا۔ اس کا قوی امکان ہے کہ ماہ دو ماہ ۶/ماہ یا سال بھر بعد جب بھی اس کا فیصلہ آئے تو پھر کھل کر آر ایس ایس ہندوتوا کارڈ کھیلے اور جشن کے نام پر خون کی ہولی کھیلے اور جو اس وقت نہیں ہوا وہ تب ہو، یہ بھی واضح رہے کہ آنے والے چیف جسٹس کی ذہنیت پہلے ہی بعض واقعات میں ظاہر ہوچکی ہے اور اس سلسلے میں بعض مضامین بھی شائع ہوچکے ہیں، رہی بات زمین لینے یا نہ لینے کی تو اس سلسلے میں فیصلہ آنے کے بعد بہت سے لوگوں سے تبادلۂ خیال ہوا، ایک رائے بڑی اچھی آئی

کہ قیادت کو یہ فیصلہ لینا چاہیے کہ صف اول کے لوگ زمین لینے سے انکار کریں اور اپنی ہی سرپرستی میں دوسرے لوگوں کو تیار کریں جو زمین لیں (ظاہر ہے کہ زمین سنی وقف بورڈ کو ملے گی تو ان لوگوں کو اعتماد میں لینا ضروری ہے تاکہ وہ زمین لے کر ضائع نہ کرسکیں) اس پر مسجد اور مسجد کے ساتھ اس کو آباد کرنے والا عصری تعلیم کا اقلیتی ادارہ بنائیں، اس سلسلہ میں سنی وقف بورڈ کو دور کرنا اور فریق بنالینا دانشمندی کے خلاف ہوگا، اس کو اعتماد میں نہ لینا بڑی غلطی ہوگی، کیونکہ وہی اصل فریق تھا باقی سب ملی مسئلہ کے سبب معاون فریق تھے، اس لیے اس کو اعتماد میں لے کر اس کی صحیح رہنمائی اشد ضروری ہے۔

ان ہی لوگوں سے اس فیصلے کے خلاف یہ اپیل کرائی جائے کہ جب ۶۷/۱ ایکڑ زمین لی جارہی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کیا جارہا ہے کہ مسجد کا گرانا غلط تھا تو پھر یہ ۵/۱ ایکڑ زمین کس بنیاد پر دی جارہی ہے، جب مالکانہ حق ثابت نہیں ہوا تو ۵/۱ ایکڑ کیوں؟ اور اگر بطور تصفیہ دینا ہی ہے تو ۶۷/۱ ایکڑ دینا چاہیے، دوسرا سوال یہ کرنا چاہیے کہ جب مندر بنانے کے لیے سپریم کورٹ نے حکومت کو ٹرسٹ بنا کر اس کی نگرانی کے لیے کہا ہے تو پھر مسجد کے لیے کیوں نہیں؟ تیسرا سوال یہ کرنا چاہیے کہ جب سپریم کورٹ نے یہ تسلیم کرلیا کہ ۶/دسمبر ۱۹۹۲ء کی کارروائی مجرمانہ اور غیر قانونی عمل تھا تو پھر مجرمین کو سزا دینے اور مقدمہ فیصل کرنے میں اتنی تاخیر کیوں؟ یقیناً قیادت اگر زمین نہ لینے کا فیصلہ کرتی ہے تو یہ اس کا اجتماعی فیصلہ ہوگا اور کوئی اس کو زبردستی نہیں دے گا مگر سنی وقف بورڈ نے لے لیا تو پھر مسلمانوں کا یہ انتشار کس زمرے میں رکھا جائے گا، زمین لے کر مسجد بنانے کا ہمارے نزدیک ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ علامتی طور پر بابری مسجد کی یادگار ہمیشہ وہاں قائم رہے گی اور ہندوؤں کا کسی بھی شہر بطور خاص ایودھیا کو ''مسلم مکت'' بنانے کا خواب پورا نہیں ہوگا، ہندوؤں کی طرف سے ایسے مطالبات شروع ہوگئے کہ اس کا نام بابری مسجد نہ رکھا جائے، اس سے اندازہ کرنا چاہیے کہ یہ صرف مسجد کا نہیں ہماری تاریخ اور ہمارے تشخص سے جڑا ہوا مسئلہ ہے، ذرا سوچیے کہ سپریم کورٹ میں سماعت شروع ہونے سے قبل کتنے لوگوں کو بابری مسجد کی شہادت یاد آتی تھی، اور کتنے لوگ اس حادثہ کو یاد رکھتے تھے، رفتہ رفتہ اندوہناک واقعات بھی انسانی ذہن سے محو ہوجاتے ہیں، لیکن اگر وہاں یہ مسجد تعمیر ہوجاتی ہے تو آئندہ نسلیں بابری مسجد کی شہادت کو یاد رکھیں گی، اس کا نام کچھ بھی رکھ دیا جائے مگر ہندو مسلمان سبھی اس کو سوائے بابری مسجد کے کچھ نہیں کہیں گے، بلکہ یہ مسجد ہمیشہ اپنی تاریخ زندہ رکھے گی اور اپنے وجود سے بھارتی جمہوریت کے ظلم اور عدالتی ناانصافی کی کہانی سنائے گی، یہ بھی ویسے ہی تاریخی بابری مسجد کہلائے گی، جیسے ہماری تاریخ میں بابری مسجد تھی، وہ کون سا منحوس دل ہوگا جس کے دل میں بابری مسجد کا مزار نہ ہو مگر اس کی علامت کا وجود بھی بہرحال ضروری ہے۔

بہرحال اس فیصلے کے بعد الجھنے اور خود ملت کو انتشار میں پڑنے سے بچانے کی اشد ضرورت ہے، کیونکہ اور بھی اہم مسائل آئندہ درپیش ہیں، ہم پہلے اپنی تحریروں میں اس تعلق سے لکھ چکے ہیں اور بار بار متوجہ کرچکے ہیں، کل سے سرمائی اجلاس شروع ہورہا ہے، اس میں سب سے اہم مسئلہ CAB بل پیش ہونے والا ہے، جو پورے ملک کے مسلمانوں کے وجود کے لیے انتہائی خطرناک ہے، بلکہ اب تک کی تاریخ میں مسلمانوں پر سب سے بڑا حملہ ہے، اگر ہم اب بھی صرف اسی مسئلہ میں الجھے رہے، اور اپنے آپسی وانفرادی وانتظامی تنازعات میں پڑے رہے تو آئندہ ہم بڑے خطرناک موڑ پر کھڑے ہوں گے، مذہب کی تبدیلی پر پابندی کا بل بھی اس سیشن میں پیش کیا جائے گا، جس کی زد صرف ہمارے دعوتی مشن اور فریضہ اور مستقبل کی امیدوں پر پڑے گی، کیونکہ صرف اسلام ہی وہ مذہب ہے جس کے متعلق اغیار کو پنپنے، پھلنے اور پھولنے کا خدشہ ہے، ساتھ ہی سپریم کورٹ نے سبری مالا

مندر کے مقدمہ کو سات ججوں کی بینچ کے حوالے کر دیا ہے اور اس موقع پر چیف جسٹس نے یہ تبصرہ کیا ہے کہ اس پر جو فیصلہ آئے گا اس کا اثر پارسی مندروں اور مسجدوں پر بھی پڑے گا، اس حکومت کی موجودگی میں اس ملک میں ہم ہر وقت حالتِ جنگ میں ہیں، عقلمندی کا تقاضا ہے کہ اب ہم اس بات کو سمجھ لیں، حالانکہ ان لوگوں کو یہ بات مشکل سے سمجھ میں آئے گی جن کو اچانک اس طرح حالات کی تبدیلی کا کبھی گمان بھی نہ گذرا تھا، جن کے ایک اشارے پر پچھلی حکومتوں میں کچھ نہ کچھ لوگوں کے چھوٹے چھوٹے کام ہو جایا کرتے تھے، لیکن اب حالات یکسر بدل چکے، متعدد بل پاس ہو کر مصیبت بن چکے، بی جے پی کی آئندہ سیاست کا بہت بڑا کارڈ CAB بل پاس ہونے پر منحصر ہے، اس کے بعد یونیفارم سول کوڈ پر تیزی سے سوچا جائے گا، جس کے متعلق ۹ رنومبر کو راجناتھ سنگھ نے اظہار بھی کر دیا کہ اب اس کے نفاذ کا وقت آ گیا ہے، ظاہر ہے کہ CAB ہندوراشٹر کی طرف ایک قدم ہے تو یونیفارم سول کوڈ آخری قدم، اپوزیشن میں یا تو دم خم نہیں، یا تو مجبور و بے بس ہے یا پھر آقاؤں نے چپ کر دیا ہے، اپوزیشن پارٹیوں کو جھنجوڑنا بھی ہماری ذمہ داری ہو گئی ہے، خصوصاً اس سرمائی اجلاس سے پہلے (آپ تک رسالہ پہنچنے سے پہلے یہ بات ہم سوشل سائٹس کے ذریعہ لوگوں تک پہنچا سکے یہ الگ بات ہے کہ بہت سے قائدین پہلے ہی این آر سی کے جواز و افادیت کی تائید کر چکے، جس سے لگتا ہے کہ یا تو ان پر حقائق اور اس کے نقصانات مخفی ہیں یا پھر کوئی مجبوری دامن گیر ہے، البتہ اتنی بات طے ہے کہ این آر سی کے عمل سے کسی بھی علاقہ کے اشرافیہ کو کوئی گزند نہ پہنچے گا) سب کچھ بھول کر ان بلوں کے پاس نہ ہونے کے لیے کامیاب اجتماعی کوششیں، لابنگ اور عوامی احتجاج کرنے میں اگر ہم کامیاب ہو جاتے ہیں تو آئندہ کا مطلع کچھ اور ہونے کی امید ہے، ایسا اس لیے بھی ہو سکتا ہے کیونکہ حکومت اب بھی راجیہ سبھا میں اکثریت میں نہیں ہے، اور مہاراشٹر میں واضح اکثریت نہ ملنے سے اس کو راجیہ سبھا میں بھی نقصان ہوگا، مزید یہ کہ شیوسینا بھی این ڈی اے سے الگ ہو چکی ہے، اگرچہ ہندتوا کو لے کر CAB اس کے لیے پہلا امتحان ہے، کیونکہ امت شاہ نے اس کو اپنے کلکتہ کے خطاب میں ہندوؤں کی حمایت و رعایت کا بل بنا کر پیش کیا تھا، لہٰذا ضروری ہے کہ ہم انتشار سے بچ کر اتحاد و اتفاق اور حکمت و دانش کے ساتھ آگے بڑھیں اور بہت چالاکی کے ساتھ قدم اٹھائیں، اپنی پالیسیوں اور ترجیحات پر از سر نو غور کریں، غیروں سے رابطے بڑھانے اور اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے کی مہم کے ساتھ اپنوں کے ساتھ بھی تعاون و رابطے کی مہم تیز کریں، خود ہمارے یہاں بھی آپس میں رابطے، تبادلۂ خیال اور آپسی گفت و شنید کی ایسی ہی کمی ہے جیسے منصوبہ بندی کی، اس پہلو سے بھی اب غور کرنا بہت ضروری ہے کہ ہم اس ملک میں ایک کامیاب سیاسی طاقت کیسے حاصل کریں، کیونکہ کامیاب سیاسی قوت کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں، ہمارے یہاں ایک نظریہ سیاست کو شجر ممنوعہ سمجھنے کا ہے، دوسرا موقف نیم سیاسی بازیگری کا ہے، تیسرا موقف ملکی دھارے کے بالمقابل ''مسلم سیاست'' کا ہے اور چوتھا نظریہ مسلمانوں کا مختلف پارٹیوں کی پالیسیوں میں جکڑ کر زندہ رہنے کا ہے، ایسے حالات میں ہماری قوم کے بااختیار لوگوں کو کم از کم اب قومی تاریخ کا سب سے بڑا مقدمہ ہارنے کے بعد ایک پلیٹ فارم پر آ کر غور کرنا اور متحدہ سیاسی پالیسی اختیار کرنا بالکل لازمی ہو گیا ہے، ان پہلوؤں پر غور و فکر عمل کیے بغیر کسی بھی کامیابی کا امکان تقریباً ناممکن ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

☆☆☆

(ڈاکٹر محمد طارق ایوبی)

❑ خاص تحریر

قسط-۳

عالم عربی کی صورت حال-احادیث کی روشنی میں

مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
ناظم تعلیمات، دارالعلوم امام ربانی، نیرل

عالم عربی کے موجودہ حالات اس کے متقاضی ہیں کہ ہم اس کا جائزہ، تحلیل وتجزیہ صرف خبروں کی بنیاد پر نہ کریں بلکہ ''جو ہورہا ہے اور ہونے واالا ہے'' اس کو نصوص کتاب وسنت کی روشنی میں دیکھنے اور حالات کے رخ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

عراق وشام ومصر کی تباہی: (عراق کی حالت زار)

عراق، شام، مصر فلسطین اور یمن کا تذکرہ اور ان میں پیش آنے والے حالات کا تذکرہ احادیث فتن میں خوب کثرت سے آیا ہے، ہم صرف چند احادیث ذکر کریں گے جس کے اشاروں میں حالات حاضرہ کو سمجھنے میں مدد ملے گی، نعیم بن حماد مروزیؒ نے اپنی کتاب الفتن میں حضرت کعب الاحبارؓ کی روایت نقل کی ہے، روایت یوں تو سنداضعیف ہے مگر اس کے الفاظ ان ممالک کی حالت زار کی حقیقی ترجمانی کرتے ہیں، حضرت کعبؒ فرماتے ہیں:

''ليوشكن العراق يعرك عرك الأديم، و يشق الشام شق الشعر، وتفت مصر فت البعرة، فعندها ينزل الأمر'' (کتاب الفتن نعیم بن حماد)

قریب ہے کہ عراق کو چمڑے کی طرح رگڑ دیا جائے گا، ملک شام کو بال کی طرح پھاڑ دیا جائے گا، اور مصر کو اونٹ کی مینگنی کی طرح توڑ کر رکھ دیا جائے گا، اس کے بعد خدا کا فیصلہ نازل ہوگا''۔

نعیم بن حماد مروزیؒ متوفی ۲۲۹ھ جلیل القدر محدث ہیں، امام بخاری کے استاد بھی ہیں، یہ روایت حضرت کعب الاحبار کی موقوف روایت ہے، جس کو نعیم بن حماد نے اپنی کتاب الفتن میں ذکر کیا ہے، حضرت کعب الاحبارؓ کی مرویات یوں بھی سنداضعیف ہوتی ہیں، اور یہ تو فتن سے متعلق ایک اثر ہے، مگر سندی ضعف کی باوجود ایک تو موجودہ حالت زار اور ان ممالک کی صورتحال اس کی عملی تائید ہے، دوسری مسلم کی وہ روایت جس کو ہم اس سے قبل بیان کر چکے ہیں، وہ اس کے لئے معنوی مؤید ہے۔

احادیث فتن میں ملک شام، مصر اور عراق کا تذکرہ خصوصیت کے ساتھ آیا ہے، جس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ یہ ممالک فتنہ وخونریزی کا مرکز ہوں گے، ان ممالک میں انتشار وابتری پھیلے گی، اسلام ونفاق اور حق وباطل کی رزم گاہ قائم ہوگی، اور اسی رزم گاہ میں حق کو بہر حال فتح ونصرت نصیب ہوگی، اسلام کا پرچم بلند ہوگا، ساتھ ہی یہ اشارے بھی واضح طور سے موجود ہیں کہ ان حالات میں اہل اسلام کو امیدیں ہار کر نہیں بیٹھنا ہے، بلکہ حق کی سربلندی کے لئے باطل سے پنجہ آزمائی کرتے رہنا ہے۔

حدیث مذکور کا پہلا جملہ بہت قابل غور ہے۔ اس میں عراق کے تعلق سے کہا گیا ہے کہ'' يعرك عرك الأديم '' یہ

الفاظ عراق کی تباہی کی داستان کی صحیح منظر کشی ہیں، لفظ ''عرک'' کا مطلب عربی زبان میں ہوتا ہے ''چمڑے کو صاف کرنے کے لئے رگڑنا'' شدید حملہ کرنے کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے، اسی سے لفظ ''معرکہ'' جنگ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اس روشنی میں مطلب یہ ہوا کہ ''عراق کو اس طرح شدید حملوں کے ذریعہ رگڑ دیا جائے گا جیسے چمڑے کو دباغت دینے والے رگڑتے اور گھستے ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں اور ایک نظر ڈالتے ہیں کہ موجودہ حالات اور منظر نامہ میں عراق کو کس طرح جنگ کی بھٹی میں جھونکا گیا ہے، اور عالم عربی پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔

اقتدار کی ہوس، صلیبی جنگوں کے انتقام، عالم عربی کے ذخائر پر ناجائز قبضہ کی آرزو اور اپنے سپر پاور ہونے کے غرور نے امریکہ کو عالم عربی پر تسلط کا خواب دکھایا، اور ان کے اندر مسلمانوں سے انتقام کے جذبہ نے انگڑائی لی، اور دوسری جانب یہودی عالمی ریاست کی توسیع وتحفظ کے لئے یہ ضروری تھا کہ شرق اوسط کے خطہ میں اسرائیل کے لئے خطرہ ثابت ہونے والی ہر طاقت کو کچل دیا جائے، یا پورے منطقہ میں اہل اسلام کو پیہم جنگوں کے ذریعہ دونیم کرکے یہودی ریاست کے تخیل کی راہیں ہموار کی جائیں، مختلف مذموم مقاصد کے پیش نظر عالمی استعماری قوتیں مور وملخ کی طرح عالم اسلام پر ٹوٹ پڑیں، چنانچہ ۲۰۰۳ء میں امریکہ نے عراق پر حملہ کیا، جس کے بعد بالآخر عراق پر امریکی تسلط قائم ہوگیا، اس سیاسی تسلط میں برطانیہ اور دیگر ممالک بھی امریکہ کے حلیف تھے، عراق پر اس حملہ اور یورپی اقوام کے حملوں کے نتیجہ میں لاکھوں لوگ مارے گئے، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ عراق میں شکست وریخت کے بعد یا تقریبا اس کے ساتھ ہی پورے منطقہ شرق اوسط میں خوں ریزی وقتل وقتال، اور دہشت گردی کے خاتمہ کے نام سے موت کا ننگا ناچ شروع ہوگیا۔

''اسامہ کامل ابوشقری'' نے فروری ۲۰۱۲ء کو ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان ہے'' دمار العرب من دمار العراق '' ''عراق کی تباہی سے عربوں کی تباہی کا آغاز'' فاضل مضمون نگار نے سابق صدر لبنان ''کمیل شمعون'' (Camille Chamoun) کا ایک جملہ نقل کیا ہے'' مادام العراق بخير فالبلاد العربية بما فيها لبنان بخير '' جب تک عراق صحیح سلامت ہے، عرب ممالک بشمول لبنان بھی سلامت رہیں گے'' (http://www.alhayat.com/article/820391) میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ''کمیل شمعون'' نے یہ الفاظ کیوں کہے تھے، لیکن بعد میں تاریخی حوادث اور جنگوں کے حالات نے ثابت کردیا کہ عراقی تباہی اور امریکی واتحادی ممالک کے ذریعہ عراق کی شکست وریخت سے دیگر عرب ممالک بھی تباہی کی دلدل میں گرتے چلے گئے، دنیا کی آنکھوں نے دیکھا اور دیکھ رہی ہیں کہ عراق کے بعد شام، مصر، یمن اور دیگر ممالک میں کشتوں کے پشتے لگ گئے، انسانی خون اور لاشوں کے انبار لگ گئے، نہ مقتول کو یہ معلوم ہوسکا کہ اس کی کیوں جان لی گئی، نہ قاتل وسفاک جان سکے کہ وہ کیوں ظلم کررہے ہیں، جنگوں کی آگ ہے جو بجھنے کا نام نہیں لیتی، خون کے دریا اور قیامت کے مناظر ہیں کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتے۔

شرق اوسط کی تباہی اور موجودہ امریکی جنگوں کی تاریخ کے صفحات کو الٹ کر دیکھا جائے تو حیرت انگیز حقائق سامنے آتے ہیں، مشہور امریکی جنرل ''وسلی کلارک'' (Wesley Clark) نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے''Winning Modern Wars'' اس نے اپنی اس کتاب اور اپنی بعض تقریروں میں واضح کیا ہے کہ امریکی فوج کے ایک اعلی افسر سے اس کی ملاقات ہوئی، اور باہم گفتگو میں شرق اوسط کی جنگ کے موضوع پر جب تبادلہ خیال ہوا تو اس نے بتایا کہ آئندہ پانچ سالوں میں سات ممالک سے

دہشت گردی کو ختم کرنا ہے، جن میں عراق سے ابتدا ہوگی، اس کے بعد شام، لبنان، ایران، صومال، اور سوڈان کا نمبر آئے گا، اس نے اپنے ایک ویڈیو (https://youtu.be/HvhPXzsSFIA) میں یہ بھی کہا ہے کہ امریکی انتظامیہ کو اس کا اعتراف ہے کہ عراق یقیناً نائن الیون کے حادثہ میں ملوث نہیں ہے، نہ ہمارے پاس اس کے ثبوت ہیں، تاہم جس طاقتور کے ہاتھ میں ہتھوڑا ہو تو اس کو اپنی طاقت دکھانے کے لئے ضروری ہے کہ ہر مشکل اور متوقع خطرہ کو کیل سمجھ کر ٹھونک دینا چاہئے۔ مجھے یہاں عراقی جنگ کا تاریخی تجزیہ کرنا مقصود نہیں ہے تاہم یہ اشارہ کرنا ہے کہ عراق پر امریکی اور حلیف ممالک کی یلغار عالم عربی میں شکست وریخت اور تباہی کا بگل ثابت ہوئی، اور جنگوں کی ایسی آگ مختلف سیاسی ودینی مقاصد کے تحت لگائی گئی کہ انسانی آبادیاں خس وخاشاک کی طرح جل کر راکھ ہوگئیں، مگر یہ آگ اب تک سرد نہیں ہوئی۔

حالات کا یہ رخ دیکھئے، حدیث مذکور کے الفاظ پر نظر ڈالئے، اور مزید ایک یہ حدیث بھی پڑھئے، صحیح بخاری ومسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے منقول ہے فرماتے ہیں کہ حضورﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اللهم بارك لنا فی شامنا،وفی یمننا، قالوا: وفی نجدنا؟قال: اللهم بارك لنا فی شامنا،وفی یمننا، قالوا: وفی نجدنا؟قال: هناك الزلازل والفتن،وبها یطلع قرن الشیطان ''(متفق علیہ) آپﷺ نے دعا فرمائی، اے اللہ! ہمارے ملک شام اور ملک یمن میں برکت نازل فرما، لوگوں نے درخواست کی، کہ ہمارے ''نجد'' میں بھی، آپﷺ نے پھر یہی کلمات دہرائے، اے اللہ! ہمارے ملک شام اور ملک یمن میں برکت نازل فرما، لوگوں نے درخواست کی، کہ ہمارے ''نجد'' میں بھی، آپﷺ نے فرمایا: یہاں فتنے وزلزلے رونما ہوں گے، یہیں پر شیطان کا سینگ ظاہر ہوگا''۔

صحیح ابن حبان میں اس روایت کے الفاظ اس طرح وارد ہوئے ہیں: ''ثم رأیت رسول الله ﷺ یشیر نحو المشرق، ویقول: ألا ان الفتنة هاهنا،ألا ان الفتنة هاهنا،من حیث یطلع قرن الشیطان '' حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ پھر میں نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا کہ آپ مشرق کی جانب اشارہ فرمارہے ہیں، اور یہ فرمارہے تھے، آگاہ ہوجاؤ، ادھر سے فتنہ رونما ہوگا، آگاہ ہوجاؤ ادھر سے فتنہ رونما ہوگا، جہاں سے شیطان کا سینگ نمودار ہوگا''

حدیث میں مذکور مشرق کی سمت سے مراد بعض محدثین نے مسیلمہ کذاب کا علاقہ مراد لیا ہے، چوں کہ مدینہ منورہ سے وہ بھی مشرق ہی کی جانب تھا، بعض محدثین نے اس سے عراق مراد لیا ہے، مسلم شریف کی ایک حدیث میں اس کا اشارہ بھی موجود ہے، حضرت سالم بن عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں: ''یاأهل العراق ،ماأسألكم عن الصغیرة، وأركبكم للكبیرة! سمعت أبی عبد الله بن عمرؓ یقول:سمعت رسول اللهﷺ یقول:ان الفتنة تجئ من هاهنا، وأومأ بیده نحوالمشرق،من حیث یطلع قرنا الشیطان ''(رواہ مسلم ۲۹۰۵) اے اہل عراق! تم صغائر کے بارے میں بہت سوال کرتے ہو، مگر کبائر کے بارے میں ذرا نہیں چوکتے ہو، کبائر کا خوب ارتکاب کرتے ہو، میں نے اپنے والد عبداللہ ابن عمرؓ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ حضورﷺ نے ارشاد فرمایا: فتنہ ادھر سے نمودار ہوگا، اور آپﷺ نے مشرق کی جانب اشارہ فرمایا، جہاں سے شیطان کا سینگ ظاہر ہوگا''۔

شیطان کے سینگ کا کیا مطلب ہے، ابن حجر نے متعدد معنی ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: '' ویحتمل أن یرید

بالقرن قوة الشيطان، وما يستعين به على الاضلال، وهـذا أوجـه'' ممکن ہے اس سے مراد شیطانی طاقت اور اس کے گمراہ کرنے کے طریقے ہوں، بہ ظاہر یہی بات معقول لگتی ہے'' ابن حجر نے علامہ خطابی کا قول بھی ذکر کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ''قرن'' سے مراد زمانہ ونسل بھی ہوتی ہے، لہذا حدیث مذکور کا مطلب ہوگا کہ یہاں شیطانی نسل ظاہر ہوگی۔

حدیث کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرق کی جانب سے اٹھنے والے فتنے خطرناک بھی ہوں گے اور وہیں سے ابتداء بھی ہوگی، ''شیطان کا سینگ'' شیطانی قوت وطاقت کے ساتھ نمودار ہوگا، اور ظاہر ہے کہ جب ''سینگ'' بھی شیطان کا ہو تو اس کی تباہ کاری کا کیا پوچھنا، واضح رہے کہ یہ صرف ایک اشارہ ہے، حدیث میں نہ کسی زمانہ کی صراحت ہے، اور نہ وقت واشخاص کی تحدید، البتہ اشارہ کو اشارہ کے اجمال کے ساتھ سمجھیں گے تو حالات کی بکھری ہوئی کڑیاں بڑی حد تک ایک دوسرے سے جڑتی ہوئی نظر آئیں گی، اور حیرت انگیز طور پر ظاہر ہوگا کہ یہاں ''شیطانی قوت'' اور ''شیطانی نسل'' کے علمبرداروں کے غلبہ وتسلط نے پورے عالم عربی کو کس شکنجہ میں جکڑ دیا ہے، میں ہرگز یہ نہیں کہتا ہوں کہ یہ حدیث کا قطعی اور یقینی مفہوم ہے، البتہ ایک ایسا اشارہ ضرور ہے جو حالات کے رخ اور ''شیطانی قوت وطاقت'' کے ظہور کے اثرات کا غماز ہے۔

ملک شام کی حالت زار

ہم نے نعیم بن حماد کی جو روایت ذکر کی ہے اس کا دوسرا جملہ تھا: ''ویشـق الشـام شق الشعرة'' ملک شام کو بال کی طرح پھاڑ دیا جائے گا، اس تعبیر کا خلاصہ ہے کہ شام میں داخلی انتشار، اور خانہ جنگی ہوگی، ملک شام کی موجودہ جنگ نے واضح کر دیا کہ شام کی خانہ جنگی، قتل وخوں ریزی انسانی تاریخ کا پیچیدہ اور بھیانک باب ہے۔

۲۰۱۱ء میں جب عالم عربی میں ظالم حکومتوں کے خلاف عوامی احتجاج بلند ہوئے، اس کو ''عرب بہاریہ'' کا نام دیا گیا، اس کے مثبت ومنفی دونوں طرح کے نتائج ظاہر ہوئے، منفی نتائج کا پہلو زیادہ تھا، بلکہ عالمی استعماری طاقتوں نے اس سے فائدہ زیادہ اٹھایا، ان ہی عوامی احتجاجات میں ملک شام میں بھی ظالم بشار الاسد کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی، حکومت نے اس کو کچلنے کے لئے طاقت کا بدترین استعمال کیا، جس کے نتیجہ میں معارضین نے ہتھیار اٹھالئے، اور یوں کشت وخون کا سلسلہ شروع ہوا، اور ایک ایسی جنگ کی آگ لگ گئی جس میں لاکھوں انسان قتل کر دئے گئے، ایک اندازہ کے مطابق تقریبا چالیس لاکھ سے زیادہ دربدر ہوگئے، لاکھوں انسان لاپتہ ہوگئے، شہروں کے شہر کھنڈرات میں تبدیل ہوگئے، شام کے مظالم اور انسانی خون کی ارزانی دیکھ کر کلیجہ منھ کو آجاتا ہے، شامی جنگ صرف شامی عوام اور بشار الاسد کے درمیان ایک مسلح جد وجہد تک ہی محدود نہ رہی، اسمیں متعدد تنظیمیں، ممالک اپنے اپنے ایجنڈے اور منصوبے کے ساتھ شامل ہوتے چلے گئے، اور یوں شام کی سرزمین لاکھوں انسانوں کا مقتل بن گئی، شامی حکومت کو ایران اور روس کی حمایت حاصل ہے، ۲۰۱۵ء سے ہی روس شامی عوام پر بھیانک فضائی حملے کر رہا ہے، ایران ایک طرف شامی حکومت کی ہر طرح مدد کرتا ہے، دوسری طرف ہزاروں شیعہ جنگجوؤں کو تربیت دے کر اس نے اہل سنت کے خلاف میدان میں اتار دیا ہے، شیعی دینی وسیاسی مقاصد کے پیش نظر حزب اللہ (لبنان) شامی جنگ میں حکومت کے شانہ بشانہ ہے، اس طرح ایک طرف یہ شیعی مثلث اس جنگ کا حصہ ہے، بشار الاسد نصیری علوی شیعہ ہے اس کی قیادت میں یہ ایک ایسی شیعہ سنی جنگ بن گئی جس میں ایران مذہبی اور سیاسی دونوں مقاصد کے پیش نظر شامل ہوگیا، اور دیگر ممالک کے شیعہ سنی گروپ بھی اس کا حصہ بن گئے، دوسری طرف مغربی استعماری طاقتوں نے

کبھی باغیوں اور کبھی شامی حکومت کی تائید اپنے منصوبوں کے مطابق کی ہے، ایران اور حزب اللہ بہ ظاہر اسرائیل کے حریف ہیں، اسی لئے شامی جنگ میں اسرائیل روس کے ساتھ شامل تو ہے، مگر اس کے مقاصد میں شامی جہادی تنظیموں کے خاتمہ کی خواہش بھی ہے، اور ایران وحزب اللہ اس کی آنکھ کا کانٹا ہیں، واشنگٹن پوسٹ کے ایک تجزیہ کے مطابق جس کا خلاصہ ''خلیج اون لائن'' پر ۷/ مارچ ۲۰۱۸ء کو شائع ہوا تھا اسرائیل کے لئے سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ شامی جنگ کے خاتمہ پر ایران وحزب اللہ کے تعلق سے شامی حکومت کا موقف کیا ہوگا؟ یہ اس کے لئے بہت بڑا چیلنج ہے، جس کے تدارک کے لئے بہر حال وہ روس کی ہمنوائی سے امید رکھتا ہے۔ (http://khaleej.online/LqWJY7)۔

یہ داستان بھی بہت طویل ہے کہ بہت سے افراد وتنظیمیں ''جہاد آخر الزمان'' اور مہدی کے ظہور کی تمہید کے لئے دینی جذبات کے ساتھ اس میں شامل ہوتے چلے گئے، اور قتل وقتال کا معرکہ گرم سے گرم تر ہوتا رہا اور ہو رہا ہے، دوسری طرف بعض متشدد اور فتنہ پرور نام نہاد جہادی تنظیمیں اسلامی حکومت کے قیام کی آرزو میں آگ وخون کے اس دریا میں اتر گئیں، الغرض شامی جنگ کی حالت یہ ہوگئی کہ آگ کا دریا، انسانی لاشیں، اجڑے شہر، ویران بستیاں قیامت خیز منظر پیش کر رہی ہیں، اور ابھی اونٹ کے کسی کروٹ بیٹھنے کی شکل نہیں دکھائی دے رہی، بلکہ ابھی ایسا لگتا ہے کہ مزید ہلاکت وتباہی آسمان کی آنکھیں دیکھیں گی۔

نعیم بن حمادؒ نے اپنی کتاب الفتن میں ایک اور روایت حضرت ابو ہریرہؓ کی نقل کی ہے، فرماتے ہیں:

''الفتنة الرابعة عمياء مظلمة تمور مور البحر، لا يبقى بيت من العرب والعجم الا ملأته ذلا وخوفا، تطيف بالشام، وتغشى بالعراق، وتخبط بالجزيرة بيدها ورجلها، تعرك فيها الأمة عرك الأديم، ويشتد فيها البلاء حتى ينكر فيها المعروف، ويعرف فيها المنكر، لا يستطيع أحد أن يقول: مه مه، لا يرقعونها من ناحية الا تفتقت من ناحية أخرى، يصبح الرجل فيها مؤمنا، ويمسى كافرا، ولا ينجو منها الا من دعا كدعاء الغريق فى البحر، تدوم اثنى عشر عاما، تنجلى حين تنجلى، وقد انحسرت الفرات عن جبل ذهب، فيقتلون عليها حتى يقتل من كل تسعة سبعة'' (کتاب الفتن ۶۷۶)

چوتھا فتنہ اندھا اور تاریک فتنہ ہوگا، جس میں سمندر کی موجوں کی طرح طغیانی ہوگی، عرب وعجم کا کوئی گھرانہ نہ بچے گا مگر اس پر خوف وذلت طاری ہوگی، وہ فتنہ ملک شام کو تباہ کرے گا، عراق پر چھا جائے گا، جزیرۃ العرب کو اپنے ہاتھ پاؤں سے کچل ڈالے گا، پوری امت کو اس میں چمڑے کی طرح رگڑ دیا جائے گا، سخت آزمائش ہوگی، معروف ومنکر کے پیمانے ایسے بدلیں گے کہ نیکی برائی، اور برائی نیکی بن جائے گی، کسی کے اندر اس کو روکنے اور اس کے مقابلے میں کچھ کہنے کی مجال نہ ہوگی، ایک جانب لوگ اصلاح کریں گے تو دوسری جانب فساد وبگاڑ پیدا ہوگا، اس فتنے میں انسان صبح کو مومن اور شام کو کافر ہوگا، اس سے کوئی نہیں بچ پائے گا مگر وہی جو ایسے دعا کرے گا جیسے سمندر میں ڈوبنے والا دعا کرتا ہے، تقریبا بارہ سال تک وہ فتنہ برپا رہے گا، اس کے اختتام پر دریائے فرات میں سونے کا خزانہ ظاہر ہوگا، اور لوگ اس پر قتل وقتال کریں گے، یہ قتل وقتال اتنا شدید ہوگا کہ نو میں سے سات افراد مارے جائیں گے''۔

یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ تو سنداً ضعیف ہے، تاہم دریائے فرات میں سونے کا خزانہ ظاہر ہونے اور اس پر قتل وغارت گری کا تذکرہ صحیح بخاری میں بھی ہے، حدیث کا

دوسرا مضمون بھی دیگر مختلف روایات سے مؤید ہے، عجیب بات یہ ہے کہ آج ان ممالک کی حالت زار، فتنہ وفساد، اور بالخصوص اس کے اثرات کا جزیرۃ العرب تک پھیلنا، معروف ومنکر کے پیمانوں کا بدل جانا اس مضمون کی عملی جھلک محسوس ہوتے ہیں، ہر چند کہ اس روایت میں بھی عموم ہے اور کسی خاص زمانہ کی تعیین نہیں معلوم ہوتی، بعض علماء ان فتنوں کو عین قرب قیامت میں وقوع پذیر مانتے ہیں، لیکن حدیث کے الفاظ کا عموم اس کا متقاضی ہے کہ جب جب بھی یہ صورت پیش آئے گی اس کا مضمون اس صورتحال پر منطبق ہوگا۔

نعیم بن حماد مروزی کی کتاب میں پہلے دوسرے اور تیسرے فتنہ کا بھی تذکرہ ملتا ہے، جس کے بعد یہ چوتھا فتنہ ملک شام کا فتنہ ہے، اس کے لئے متعدد الفاظ ''صیلم'' جڑیں اکھاڑ دینے والا، ''عمیاء'' اندھا اور کہیں ''شوی'' جلا کر خاک کرنے کرنے والا'' کے الفاظ وارد ہوئے ہیں، قدرے مشترک یہ بات ہے کہ شام کا فتنہ خطرناک وخوفناک ہوگا، ملک شام میں پیدا ہونے والے فتنے انتہائی شدید اور خطرناک ہوں گے، اس کا اشارہ ایک اور روایت سے بھی ہوتا ہے، اس کو بھی نعیم بن حماد نے حضرت کعب سے موقوفا کتاب الفتن میں ذکر کیا ہے، یہ مرفوع روایت نہیں ہے، فرماتے ہیں:

''اذا ثارت فتنة فلسطين، تردد الشام تردد الماء فی القربة ثم تنجلی حين تنجلی وأنتم قليل نادمون' '(الفتن رقم الحدیث ۶۷۵) جب سرزمین فلسطین کا فتنہ آگ کی طرح بھڑک اٹھے گا تو ملک شام اس فتنہ میں اس طرح حرکت کرے گا جیسے مشکیزہ میں پانی ہلتا ہے، پھر وہ فتنہ ایک خاص مدت کے بعد ختم ہوگا، اور تم لوگ ندامت وافسوس کرنے والے کم تعداد میں ہوگے''۔

اس روایت سے دو اشارے ملتے ہیں ایک تو یہ کہ فلسطین کے فتنہ کا اثر ملک شام پر خوب دراز ہوگا، دوسرے یہ کہ جب یہ فتنہ ختم ہوگا تو ہلاکت خیزیوں کے بعد اہل اسلام کی تعداد کم ہوگی، یہ فتنہ سرزمین فلسطین سے شروع ہوگا، اور اس میں اکثر عربوں کی ہلاکت ہوگی، آج کون نہیں جانتا کہ پورے شرق اوسط کی شکست وریخت اور تباہی کا اصل سبب فلسطین میں عالمی یہودی ریاست ہے، صہیونیت کا وہ خنجر ہے جو عربوں کے سینہ میں پیوست کر دیا گیا، اس فتنہ کے ہاتھوں پورے منطقہ کی تباہی ایک کھلی کتاب ہے، یہاں یہ خوب اچھی طرح یاد رکھنا چاہئے کہ شرق اوسط کے خطہ میں جو کچھ ہو رہا ہے اس میں اصل بنیادی سبب تو یہود کی عالمی ریاست کا استحکام، تحفظ اور توسیع ہے، امریکہ اسرائیلی مقاصد کی تکمیل کے لئے اس کا دست وبازو ہے، اور عالم عربی کی دولت کے ذخائر پر قبضہ کا حریص ہے، شیعیت کی مذہبی منافرت کو یہود نے ہوا دی ہے، جس کی وجہ سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ شیعیت کے بے رحم ہاتھوں اہل اسلام کا خون ہی نہیں ہو رہا ہے، بلکہ حقائق ایسے ہیں کہ جو ظلم یہودی ومسیحی نہیں کر سکتے شیعہ اہل اسلام کے ساتھ کر رہے ہیں، اہل سنت کے ساتھ ان کی انتقامی کاروائیوں سے تاریخ بھری ہوئی ہے، یہاں میں امام ابن تیمیہ کی ایک عبارت بطور جملہ معترضہ ذکر کرتا ہوں، امام ابن تیمیہ ان مفکرین ومؤرخین میں ہیں جنہوں نے شیعیت اور اس کے مزاج کو بہت گہرائی کے ساتھ سمجھا بلکہ اس سے پنجہ آزمائی کی ہے، ان کے اس جملہ سے یہودی وشیعی اتحاد فکر وعمل اور نفسیات کا صاف پتہ چلتا ہے، انہوں نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''منہاج السنۃ'' میں ذکر کیا ہے کہ شیعوں نے اہل حق کے خلاف ہمیشہ کفار واہل کتاب کی اعانت کی ہے، بلکہ وہ یہود کے لئے ''گدھے وخچر'' کی مانند ثابت ہوئے ہیں جن پر یہودی اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے سواری کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

''كما قد جربه الناس منهم غير مرة فی مثل اعانتهم للمشركين من الترك وغيرهم على

أهل الاسلام بخراسان والعراق، والجزيرة، والشام وغير ذلك، واعانتهم للنصارى على المسلمين بالشام ومصر وغير ذلك فى وقائع متعددة، من أعظمها الحوادث التى كانت فى الاسلام فى المأة الرابعة والسابعة، فانه لما قدم كفار الترك الى بلاد الاسلام وقتل ما لا يحصى عدده من المسلمين الا رب الأنام، كانوا من أعظم الناس عداوة للمسلمين، ومعاونة للكافرين، وهكذا معاونتهم لليهود أمر شهير، حتى جعلهم الناس لهم كالحمير''، ''شیعہ کی اہل اسلام کے ساتھ دشمنی، اور کفار ومشرکین سے ملکر اہل اسلام کو نقصان پہنچانے کا متعدد بار تجربہ ومشاہدہ ہوا ہے، جیسا کہ شیعوں نے خراسان، عراق، جزیرۃ العرب، اور شام میں اہل اسلام کے خلاف مشرکوں کا تعاون کیا، شام ومصر میں متعدد بار نصاری کی اعانت کی، سب سے بدترین حوادث شاید چوتھی اور ساتویں صدی کے تھے جب ترکستان کے کفار اہل اسلام کا قلع قمع کرنے کے لئے عالم اسلام پر ٹوٹ پڑے تھے، اور مسلمان اتنی تعداد میں مارے گئے تھے کہ بس اللہ ہی جانتا ہے، اس موقع پر بھی مسلمانوں کے ساتھ دشمنی، اور کافروں کا دست وباز وبننے میں شیعہ سب سے آگے تھے، یہود کے ساتھ تو ان کا تعاون کھلی کتاب ہے، یہاں تک کہ لوگ شیعوں کو ''یہود کا گدھا'' کہتے ہیں'' (منہاج السنۃ النبویہ ۲۰/۱)

مجھے اس کتاب کے اقتباس کی روشنی میں آج عالم عربی پر مسلط اسلام کی بیخ کنی کرنے والے عناصر کے اتحاد کا اشارہ کرنا تھا، آج کس طرح یہودی ''اس گدھے'' پر اپنی فتنہ پروری کے لئے سوار ہوکر اہل اسلام کی جڑیں کھود رہے ہیں، اور شیعہ یہودی ونصرانی مذموم مقاصد کی تکمیل کے لئے برسرپیکار ہیں، عراق، شام ویمن میں آخر عالمی قوتوں نے شیعہ سنی جنگ کیوں بھڑکائی ہے؟! ظاہر ہے کہ تاریخی تجربات سے ثابت ہے کہ اہل اسلام کی بیخ کنی اور خاتمہ کے لئے یہود ونصاری کے ہتھیاروں میں ایک بہترین ہتھیار ''شیعیت'' ہے، آج کے منظرنامہ میں شام وعراق اور یمن کی خوفناک جنگ اسی تاریخی حقیقت کی غماز ہے، اور قدیم تاریخ کا ایک ورق ہے۔

شامی جنگ اور وہاں کی خوفناک صورتحال کے ضمن میں مزید یہ روایات بھی ملاحظہ ہوں، یہ بھی نعیم بن حماد مروزیؒ نے کتاب الفتن میں ذکر کی ہیں، ''عن عبد الله بن مسعودؓ قال: كل فتنة شوى، حتى تكون فتنة بالشام، فاذا كانت بالشام فهى الصيلم، وهى المظلمة'' (کتاب الفتن رقم الحدیث ۶۵۹)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ یوں تو ہر فتنہ جلا کر خاک کرنے والا ہوگا، یہاں تک کہ ملک شام میں ظاہر ہو، جب شام میں فتنہ پیدا ہوگا تو جڑیں ہلا دینے والا ہوگا، وہ تاریک ترین ہوگا''۔

حضرت ابوالعالیہ سے منقول ہے فرماتے ہیں ''لاتعدوا الفتن شيئا حتى تأتى من قبل الشام، وهى العمياء'' (الفتن رقم الحدیث ۶۶۱) تم لوگ فتنوں کو بہت اہم نہ سمجھو یہاں تک کہ فتنہ ملک شام میں پیدا ہو، وہ اندھا فتنہ ہوگا''۔

اس طرح کی روایات کو بعض لوگ مہدی کی آمد کے حالات سے جوڑتے ہیں، مگر صحیح بات یہ ہے کہ یہ صرف استیناس اور قیاس ہی ہے، بہرحال روایات سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ سرزمین فلسطین، شام، عراق، اور مصر وغیرہ میں خطرناک فتنہ اور ہلاکت خیزیاں ہوں گی، قتل وقتال کا بازار گرم ہوگا، انسانی آبادیاں اور بستیاں اجاڑی جائیں گی، یہ بات بالکل واضح اور صاف طور سے یاد رکھنا چاہئے کہ ہم یہ قطعی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ جن خطرناک فتنوں کا اشارہ ان روایات یا دیگر

روایات میں کیا گیا ہے-،جن فتنوں کے بعد ''مہدی'' کی آمد ہوگی، ''ملحمہ کبری'' بھیانک ترین قتل وغارت گری ہوگی- وہ یہی فتنے ہیں، ملک شام میں پیدا ہونے والے نہ تو یہ پہلے فتنے ہیں، اور ممکن ہے آخری بھی نہ ہوں، ہوسکتا ہے کہ جس کو روایات میں ''عمیاء'' اندھا فتنہ،''صیلم ''جڑیں اکھاڑنے والا فتنہ، یا ''شـوی'' کھال ادھیڑنے والا فتنہ کہا گیا ہو وہ مزید اس سے بھی خطرناک شکل میں مستقبل میں رونما ہوں، یہ روایات سنداً ضعیف بھی ہیں، اوران کا قطعی علم - کہ روایات کا مصداق یہی وہ آخری فتنہ ہے-صرف اللہ کو ہے۔لیکن آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ شام کا فتنہ تمام فتنوں سے اپنی شدت میں بڑھتا اور چڑھتا دکھائی دے رہا ہے،مختلف ممالک، مختلف ایجنڈوں اور منصوبوں کے ساتھ اس جنگ میں اتر گئے ہیں، شامی جنگ کی زلفہائے برہم وپیچاں ''ویشـق الشــام شق الشعرة '' کی سچی داستان کہہ رہی ہیں۔

ملک شام کے فتنہ سے متعلق ایک اور عجیب روایت ہے، جو جامع معمر بن راشد میں حضرت سعید بن میسّب سے موقوفاً نقل کی گئی ہے، حضرت سعید بن المسیب فرماتے ہیں ''تـكـون فتــنة بــالشـام كـان أولهـا لـعـب الـصبيـان،تـطـفـو مـن جانب،وتسكن من جانب ،فـلا تتـنـاهى حتى ينادى مناد : ان الأمير فلان '' ملک شام میں فتنہ ہوگا، جس کی ابتداء ناپختہ عقل، کم عمر لڑکوں کے ذریعہ ہوگی، وہ ایک جانب بھڑکے گا، دوسری جانب پرسکون ہوگا، یہاں تک کہ پکارا جائے گا کہ تمہارا امیر فلاں ہے'' اس روایت کے نعیم بن حماد نے یہ الفاظ نقل کئے ہیں: ''تـكون فتنة بالشام كان أولها لعب الصبيان، ثم لايستـقيـم أمـر الـنـاس عـلى شيء،ولا تكون لهم جـمـاعة، حتـى يـنـادى مـنـاد مـن السـماء عليكم بفلان '' ملک شام میں فتنہ ہوگا، جس کی ابتداء ناپختہ عقل، کم عمر لڑکوں کے ذریعہ ہوگی، لوگ کسی کی قیادت وامارت پر متفق نہیں ہوں گے، نہ ان میں اجتماعیت ہوگی، یہاں تک کہ آسمان سے پکارا جائے گا، کہ فلاں کی طاعت کرو'' معجم طبرانی اوسط میں یہ روایت مرفوعاً اس طرح نقل کی گئی ہے؛'' ستـكــون فتـنة لاتهـدأ مـنهـا جـانـب الا جاش منها جانب ،حتى ينادى مناد من السماء : ان أميركم فلان ''عنقریب زبردست فتنہ رونما ہوگا، جہاں ایک طرف پرسکون ہوگا، دوسری طرف بھڑک اٹھے گا، یہاں تک کہ آسمان سے ندا آئے گی کہ تمہارا امیر فلاں ہے''۔

روایات سنداً یقیناً متکلم فیہ اور ضعیف ہیں، اور قدرے مشترک متعین بات یہ ہے کہ جس امیر کا اشارہ ہے اس سے مراد ''مہدی'' ہیں، یہاں موجودہ حالات میں قابل غور بات یہ ہے کہ شام کے حالیہ فتنہ کی ابتداء '' لـعب الصبيان ''ناپختہ عقل، کم عمر، ناتجربہ کار نوجوانوں کے غیر منصوبہ بند جذبات سے ہوئی ہے، اور پھر آگ وخون کی اس دلدل میں بنیادی مشکل ''قیادت کا فقدان'' ہے، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا اب واقعی ''ناتجربہ کار'' اور ''ناپختہ شعور'' نوجوانوں کے ذریعہ پیدا ہونے والے اس فتنہ کے بعد ''صالح متفقہ'' قیادت وجود میں آئے گی، اور اس بھنور سے مسلمانوں کو نکلنا نصیب ہوگا، یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جس ترتیب سے مختلف روایات میں فتنوں کی ترتیب ذکر کی گئی ہے موجودہ منظر نامہ میں وہی ترتیب دکھائی دیتی ہے، کہ پہلے عراق پھر شام پھر مصر فتنوں کی آگ میں جھلسیں گے، چنانچہ مسلم کی روایت جو ہم نے پہلے ذکر کی تھی اس میں اسی ترتیب کا اشارہ ہے، اور نعیم بن حماد کی اس روایت میں بھی جس سے ہم نے یہاں بات شروع کی ہے۔

آخر شامی جنگ کا کیا انجام ہوگا؟ سیاسی وصحافتی تجزیہ نگار جو کہتے ہوں مجھے فی الحال نہ اس کی تفصیل میں جانا ہے اور نہ اس کو یہاں بیان کرنا ہے، ہمارا ایمان ہے کہ حق

وانصاف،اور ایمان وعدالت کے علمبرداریہیں سے نکلیں گے،نہنگوں کے نشیمن تہ وبالا کرنے والی موج تند جولاں یہیں سے اٹھے گی،''فسطاط ایمان'' کی فوج یہیں خیمہ زن ہوگی،اور اجڑا شام پھر باغ ارم بنے گا۔

جس طرح ملک شام میں پیدا ہونے والے فتنوں کا احادیث میں اشارہ موجود ہے،وہیں ملک شام کے فضائل،اور وہاں رہنے والے صالح افراد کا تذکرہ بھی ملتا ہے،جن سے بڑی حد تک عصر حاضر کے حالات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے،ہم نے اس سے پہلے ایک روایت ذکر کی ہے جس میں ملک شام میں برکت کی دعا اور ملک شام میں سکونت اختیار کرنے کا مشورہ موجود ہے، یہاں ایک دو روایت مزید ذکر کی جاتی ہیں،سنن ترمذی میں زید بن ثابتؓ کی حدیث منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:''کنا حول رسول الله ﷺ نؤلف القرآن من الرقع، اذقال: طوبى للشام، قيل ولم؟ قال ان ملائكة الرحمن باسطة أجنحتها عليهم ''(رواہ الترمذی)ہم حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے،اور قرآن مجید کو مختلف کاغذ کے ٹکڑوں سے لکھ رہے تھے،اچانک ایک دن آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:'' آفریں،اور خوش بختی ملک شام کے لئے! دریافت کیا،ایسا کیوں ہے اللہ کے رسول! آپ ﷺ نے فرمایا: رحمٰن کے فرشتے اپنے پروں کو ان پر پھیلائے ہوئے ہیں،'' شام کے مختلف فضائل کے ساتھ روایات میں یہ اشارے ملتے ہیں کہ آخری زمانے میں ملک شام میں بہترین صالح لوگ اکٹھا ہوں گے، اہل ایمان جمع ہوں گے،حضرت عیسی علیہ السلام یہیں نزول فرمائیں گے،ان اشاروں سے متعلق چند روایات ملاحظہ ہوں،سنن ترمذی،مسند احمد،اور صحیح ابن حبان کی حدیث ہے،حضرت بن قرہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اذا فسد أهل الشام فلا خير فيكم،لاتزال طائفة من أمتي منصورين، لايضرهم من خذلهم حتى تقوم الساعة ''جب اہل شام بھی فساد وبگاڑ کا شکار ہو جائیں،تو پھر تم لوگوں میں کوئی خیر نہیں،میری امت کی ایک جماعت مدد یافتہ ہوگی،ان کو بے یار ومددگار چھوڑنے والے ان کو نقصان نہ پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آجائے''اس روایت کے دو پہلو بہت قابل غور ہیں،ایک یہ کہ اہل شام کا فساد وبگاڑ امت کے عمومی فساد کا پیمانہ ہے،ابن حبان نے اس حدیث پر جو باب قائم فرمایا ہے وہ بہت معنی خیز ہے،''ذكر الأخبار على أن الفساد اذا عم في الشام يعم ذلك في سائر المدن '' ''ان روایات کا بیان کہ جب فساد شام میں پھیلے گا تو دیگر ممالک میں بھی عام ہوگا'' اس کا واضح صاف مطلب یہ ہے کہ شام کا فساد امت کے عمومی فساد کا مقیاس وپیمانہ ہے،اس ملک کے فساد وبگاڑ سے دیگر علاقوں اور ممالک کے بگاڑ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے،اس حدیث کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: میری امت کا ایک طبقہ اور جماعت ''طائفہ منصورہ'' ہوگا،خدا کی طرف سے اس کی نصرت واعانت کی جائے گی، اس کو چھوڑنے والے نقصان نہیں پہنچا سکیں گے، یہ کون لوگ ہیں؟ شراح حدیث نے مختلف آراء ظاہر کی ہیں،بعض حضرات کے نزدیک اہل علم،اور محدثین مراد ہیں،جنہوں نے علم نبوی کی خدمت کی ہے،بعض حضرات نے سرحدوں پر حفاظت و''رباط'' کا فرض انجام دینے والے مجاہدین مراد لئے ہیں،امام نوویؒ نے شرح مسلم میں فرمایا ہے:''ويحتمل أن هذه الطائفة مفرقة بين أنواع المؤمنين، منهم شجعان مقاتلون، ومنهم فقهاء، ومنهم محدثون،ومنهم زهاد، وآمرون بالمعروف وناهون عن المنكر،ومنهم أهل أنواع الأخرى من الخير،ولايلزم أن يكونوا مجتمعين،بل قد

يكون متفرقين فى أقطار الأرض' '(شرح مسلم نووی رکتاب الامارۃ) ''حدیث میں طبقہ منصورہ کا تذکرہ ہے اس سے مراد اہل ایمان کی متعدد جماعتیں ہوسکتی ہیں، ان میں جہاد وقتال کے جذبہ سے سرشار سربکف مجاہدین بھی شامل ہیں، ان میں فقہاء ومحدثین بھی شامل ہیں، اس سے مراد اصحاب زہد وتقوی، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے والے داعی بھی مراد ہیں، اور امت میں دیگر خیر کے کام کرنے والے افراد بھی مراد ہیں، یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ یہ افراد صرف کسی ایک ہی سرزمین پر آباد ہوں، عین ممکن ہے کہ زمین کے مختلف خطوں میں رہتے ہوں''۔

بعض روایات میں اس طبقہ منصورہ کے تعلق سے یہ وضاحت بھی موجود ہے''هم فى بيت المقدس وأكناف بيت المقدس' 'یہ لوگ بیت المقدس اور اس کے اطراف میں ہوں گے، ہم اس روایت پر مستقل آئندہ تفصیل سے روشنی ڈالیں گے، یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ آخر کچھ تو خاص بات ہے کہ ملک شام میں بگاڑ کو امت کے عمومی فساد وبگاڑ کا پیمانہ قرار دیا گیا ہے، اور اس کا مشاہدہ ہورہا ہے، نیز اس سرزمین اور بیت المقدس کی سرزمین میں اہل علم وورع، مجاہدین ومرابطین، اور اہل حق کو فتح کی نوید سنائی گئی ہے، اور صاف اشارے موجود ہیں کہ دجال اور دجالی فتنوں کی سرکوبی کے لئے جو افراد اٹھیں گے، نصرت الٰہی ان کے ہم رکاب ہوگی۔

ملک شام کے تعلق سے ایک اور حیرت انگیز روایت ملاحظہ ہو، جس کی روشنی میں موجودہ منظر نامہ کے رخ کو بڑی حد تک سمجھنے میں مدد ملتی ہے، امام احمد نے مسند میں اور نعیم بن حماد نے''کتاب الفتن'' میں حضرت ابوامامہؓ سے موقوفاً نقل کیا ہے فرماتے ہیں:'' لاتقوم الساعة حتى يتحول خيار أهل العراق الى الشام، ويتحول شرار أهل الشام الى العراق، وقال ﷺ: عليكم بالشام' '(کنز العمال ۳۹۶۰۵، الفتن نعیم بن حماد ص ۴۲۷) قیامت نہیں آئے گی یہاں تک کہ عراق کے بہتر لوگ ملک شام نہ منتقل ہوجائیں، اور شام کے برے لوگ عراق نہ منتقل ہوجائیں''

اس حدیث میں یہ عجیب اشارہ ہے کہ عراق کے بہترین اور صالح لوگ شام کی جانب ہجرت کرجائیں گے، اور شام کے شر پسند وفسادی عناصر اور برے لوگ شام چھوڑ کر عراق چلے جائیں گے، اور ملک شام اہل خیر کا مسکن، اور اچھے افراد کا وطن ہوگا، اس طرح کے اشارے اور بھی دیگر روایات میں موجود ہیں، ظاہر ہے کہ اس سے کسی زمانہ کی تعیین بالضبط تو نہیں کی جاسکتی، اسی لئے حافظ ابن رجب حنبلیؒ نے''لطائف المعارف'' میں تاتاری حملے کے وقت عراق کی تباہی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے''جرت واقعة ببغداد وقتل بها الخليفة وعامة من كان ببغداد، وتكامل خراب العراق على أيدى التتار، وهاجر خيار أهلها الى الشام من حينئذ''(لطائف المعارف ص ۸۹) بغداد میں خوفناک حادثہ رونما ہوا، خلیفۃ المسلمین اور بغداد کے مسلمانوں کی بڑی تعداد کو قتل کردیا گیا، عراق مکمل طور پر تاتاری وحشیوں کے ہاتھوں تباہ ہوگیا، اس وقت عراق کے صالح اور بہترین افراد نے شام کی جانب ہجرت کی''۔

اس روایت سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ عراق کے اہل صلاح، اہل خیر ملک شام منتقل ہوں گے، اور شام کے شر پسند عراق میں جمع ہوں گے، جیسے آج بہت سے شیعہ عراق منتقل ہورہے ہیں، اور اس طرح عراق شر پسندوں کا مرکز بن جائے گا، اسلام کو زمانہ اخیر میں ملک شام میں استقرار نصیب ہوگا، اور مسافر اسلام کی غربت وبیکسی ختم ہوگی، حضور ﷺ کی پیدائش کے وقت حضرت آمنہ نے ملک شام کے محلات کو روشن دیکھا تھا، امام ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:'' وتخصيص الشام بظهور نوره اشارة

الی استقرار دینیه، ونبوته ببلاد الشام، ولهذا تکون الشام فی آخر الزمان معقلا للاسلام وأهله، وبها ینزل عیسی ابن مریم '' ولادت نبوی کے وقت ملک شام کے محلات کا روشن ہونا دراصل ملک شام میں دین محمدی اور نبوت محمدی کے استقرار کا اشارہ تھا، اور اس کا اشارہ تھا کہ آخری زمانہ یہی ملک اسلام اور اہل اسلام کی پناہ گاہ ہوگا، یہیں عیسی ابن مریم نازل ہوں گے'' مسند احمد اور سنن أبوداؤد میں حضرت ابودرداء کی روایت منقول ہے جو موجودہ شامی جنگ اور آگ وخون کے اس اندھیرے میں اہل حق کے لئے امید کی طلعت ہے، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''فسطاط المسلمین یوم الملحمة بالغوطه الی جانب مدینة یقال لها دمشق، من خیر مدائن الشام '' مسلمانوں کا خیمہ خطرناک ترین جنگ کے کے وقت ''غوطہ'' میں ہوگا، جو ملک شام کے سب سے بہترین شہر دمشق کے قریب واقع ہے''۔

ملک شام کے حالات کا تذکرہ بہت اختصار چاہتے ہوئے بھی طویل ہوتا چلا گیا، لیکن آج ملک شام کی جنگ، حالات، فتنہ وفساد جس رخ پر بھی ہے وہ ہمارے لئے نہ تو حیرت انگیز ہے اور نہ ہی مایوس کن ہے، نبی اکرم محمد عربی ﷺ -فداہ نفسی وروحی- نے اس کی ابتداء، انتہاء سب کے بارے میں ہمیں آگاہی بھی دی تھی، اور ان حالات میں ہمارے لئے نقشہ راہ بھی متعین کیا تھا۔

مصر کی تباہی وشکست وریخت

ہم نے جس حدیث سے بات شروع کی تھی اس روایت میں مصر کے تعلق سے یہ جملہ مذکور ہے'' وتفت مصر فت البعرة ''مصر کو اونٹ کی مینگنی کی طرح توڑ دیا جائے گا'' اس جملہ کا صاف مطلب یہ ہے کہ مصر کے خلاف ایسی سازشیں کی جائیں گی کہ اس کے امن وامان، اور اتحاد وسلامتی کو کچل دیا جائے گا، اس کو اس طرح توڑ دیا جائے گا جس طرح اونٹ کی مینگنی کو توڑ دیا جاتا ہے، اس کا جائزہ لینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم یہ یاد رکھیں کہ مصر کی جغرافیائی، تاریخی اور ثقافتی ایک حیثیت ہے جس کی وجہ سے عالمی استعماری قوتیں اس کو فراموش نہیں کرسکتی تھیں، چنانچہ عالمی طاقتوں نے اس کو اپنی سازشوں کی باڑ پر رکھا، اور یوں مصر کو بازیچہ اطفال بنایا گیا، موجودہ حالات کو سمجھنے کے لئے مصر کی تاریخ کا ایک ورق الٹ کر دیکھئے کہ کیا پس منظر تھا جس کی وجہ سے مصر کو توڑا گیا۔

ابھی ماضی قریب میں امریکہ واسرائیل اور کفر کے ساتھ اتحاد کرنے والے منافقین نے اخوان کو دہشت گرد قرار دے کر جیل کی سلاخوں اور تختہ دار تک پہنچایا، دیکھتے ہی دیکھتے ان کی جائز وقانونی حکومت کی بساط الٹ دی گئی، انتہائی تعذیب وآلام کے بعد اقتدار تک پہنچنے کے بعد اخوانیوں پر پھر مصر کی زمین تنگ ہوگئی، آخر اخوان سے کیا دشمنی تھی، ان کے ناکردہ جرم کی سزا انہیں کیوں دی گئی، ذرا غور کیجئے خلافت عثمانیہ کے زوال کے بعد جب عالم اسلام کی سیاسی وفکری قوت زائل ہوچکی تھی، اور پورے عالم اسلام بالخصوص مصر پر مغربی فکر وتہذیب کے عفریت نے پنجے گاڑ دئے تھے، ان ہی حالات میں امام حسن البناء رحمہ اللہ نے اپنی اصلاحی ودعوتی تحریک شروع کی تھی، ابناء اسلام کی تربیت کا بیڑا اٹھایا تھا، جن افراد کی انہوں نے تربیت کی تھی ان کے اندر چیتے کا جگر، شاہیں تجسس اور عقابی روح پیدا ہوئی تھی، جس وقت یہود کے مکر وسازش کے ذریعہ فلسطین میں اسرائیلی ریاست قائم کی گئی، اور یہود کے ذریعہ لاکھوں بے گناہ فلسطینیوں کو خانماں برباد کردیا گیا، یا قتل کردیا گیا تھا، ۱۹۴۸ء میں یہود سے پنجہ آزمائی اور ارض فلسطین کی حفاظت کیلئے متحدہ عرب فوج میدان میں آئیں، لیکن عرب لیگ کی قیادت میں ان بیمار ومریض افواج کو شرمناک شکست سے دوچار ہونا پڑا، عرب افواج یہودی گماشتوں کو ظلم وستم سے

نہ روک سکیں،اور اسرائیل کا خنجر فلسطین کی سرزمین میں گھونپ دیا گیا، بالآخر حسن البناء کے تربیت یافتہ تقریباً دس ہزار اخوانی نوجوان سرفروشی کی تمنا کے ساتھ آگے بڑھے،مصر، عراق، اردن، شام کے ممالک سے یہ غازی و پراسرار بندے شوق شہادت سے سرشار مختلف اخوانی قائدین کی قیادت میں روانہ ہوئے،جن میں شیخ محمد فرغلی،محمود لبیب، مصطفیٰ سباعی، شیخ امجد زہاوی وغیرہ اہم قائدین شامل تھے، اخوانیوں کی اس نوخیز جماعت نے پہلی ہی جنگ میں ایسی ضرب کاری لگائی جس نے صہیونی ریاست کے علمبرداروں کے دل میں ہیبت طاری کردی،اسی دن سے یہود اور صہیونی ریاست کی پشت پناہی کرنے والی عالمی طاقتوں کے لئے یہ ثابت ہوگیا تھا کہ اخوان متحدہ عرب افواج کی طرح مریض وکمزور نہیں بلکہ لوہے کے چنے اور ان کی ریاست کے قیام کی راہ میں شاید سلطنت عثمانیہ کے بعد سب سے مضبوط پتھر ہیں، چنانچہ اس کے فوراً بعد اخوان کی تعذیب وآلام اور قید و بند کا دور شروع ہوگیا، شیخ حسن البناء کو مظلومانہ شہید کردیا گیا، بے شمار اخوانیوں کو زنداں وسلاسل میں جکڑ دیا گیا۔

اس دن سے آج تک اسرائیل وہم نوایان اسرائیل نے اخوان کی جانب سے آنکھ بند نہیں کی تھی،مصر کی سیاسی وجغرافیائی صورتحال کی وجہ سے عالمی استعماری قوتوں نے مصر کو فراموش نہیں کیا تھا، نہ انہوں نے اخوان کی ثبات قدمی وجواں مردی کو بھلایا تھا، یہی وجہ ہے کہ جب نصف صدی کی قربانیوں کے بعد اخوان کی جائز حکومت قائم ہوئی،مرسی کے اقدامات اور غزہ کے نہتے مظلوموں کے ساتھ ان کی ہمدردی سامنے آئی، حماس کی پشت پناہی اور فلسطین کے تعلق سے مرسی کے طاقتور موقف سامنے آئے، تو ایک بار پھر ظالموں کے ذہن ودماغ میں ۱۹۴۸ء کی جنگ کی یادگار تازہ ہوگئی، اور انہیں صاف نظر آ گیا کہ اگر اخوان سیاست میں آ گئے تو صہیونی ریاست کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے، چنانچہ کفر ونفاق کے اتحاد نے ملکر اس کو ختم کرنے میں ہی اپنی خیر سمجھی، یہ قصہ بہت طویل ہے کہ یہ منصوبہ بندی کیسے کی گئی تھی، اور کن مراحل سے گذر کر ایک یہودی نژاد جنرل اپنی شناخت تبدیل کرکے کرسی صدارت تک پہونچا، صدر مرسی مرحوم نے جب سے ایوان حکومت میں قدم رکھا تھا تب سے امریکہ واسرائیل کی آنکھوں میں وہ کھٹک رہے تھے۔

الجزیرہ چینل کی ویب سائٹ پر قاہرہ میں سابق امریکی سفیر (Anne W. Patterson) کی واشنگٹن میں ایک انٹرویو کی تفصیل "مصر والسيسي ومرسي.. بعين السفيرة الامريكية" کے نام سے ۱۷؍فروری ۲۰۱۹ء کو شائع ہوئی تھی، "پیٹرسن" نے اس میں مصر کے تعلق سے امریکی پالیسی کی وضاحت کی ہے، جس میں صاف طور پر کہا ہے "مصر میں ہماری سیاسی پالیسی دوٹوک اور بالکل واضح ہے، ہماری سیاسی پالیسی میں مصر کا اسرائیل کے ساتھ تعلق وتعاون ترجیحی بنیاد کا حامل ہے"۔

(www.aljazeera.net/news/politics/2019/2/16/)

سچی بات یہ ہے کہ دراصل یہ مصر اور شرق اوسط میں امریکہ واسرائیل کی پالیسی کا وہ حصہ ہے جس کی ترجمانی "پیٹرسن" نے ان الفاظ میں کی ہے، ظاہر ہے اخوان نے جب روز اول ۴۸ ر کی جنگ میں اسرائیل کے دانت کھٹے کردئے تھے، تو اب اقتدار میں آکر صدر مرسی کے جرأت مندانہ اقدامات اور غزہ وفلسطین کے لئے ان کے جذبات وفیصلے تاریخ کے اسی سبق کو دوبارہ یاد دلا رہے تھے، اس وقت تاریخ کے مجرموں نے جو حسن البناء کے ساتھ کیا تھا وہی منظر نامہ فوجی انقلاب کے سہارے صدر مرسی کو جیل میں ڈال کر شہادت کی منزل تک پہنچا کر دہرایا گیا ہے۔

جس طرح مصر میں "اسلام پسندی" کا استحکام

یہود کے لئے گلے کی ہڈی تھا، ویسے ہی مصر کی ''کفر نوازی'' اسرائیل کے لئے خوشی کا سامان ہے، مصر جامع ازہر کی وجہ سے مسلمانوں میں ایک دینی مرکزیت وعلمی مرجعیت رکھتا ہے، اس وجہ سے بھی عالمی استعماری قوتوں کے نزدیک مصر سے ''روح محمدؐ'' اور اسلامی حمیت کو ختم کرنا ضروری تھا، اسی کے ساتھ مصر واسرائیل کے تعلقات ترجیحی حیثیت رکھتے تھے، یہ اور بعض دیگر اسباب کی وجہ سے مصر میں وہ سازشیں کی گئیں جن کی وجہ سے موجودہ المناک مظر نامہ سامنے آیا، ان حالات کو غور سے دیکھئے اور حدیث مذکور کے الفاظ پر نظر ڈالئے'' وتفت مصر فت البعرة ''ابھی بہ ظاہر اس روایت کے مطابق مصر کی مزید تباہی اور فتنہ سامانی باقی ہے، اس کو سمجھنے کے لئے بعض روایات اور حقائق پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

امام قرطبی کی ''التذکرہ'' کے حوالہ سے ابن کثیر نے ''الفتن والملاحم'' میں ایک روایت ذکر کی ہے، حضرت حذیفہ بن الیمان فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''یبدأ الخراب فی أطراف الأرض حتی تخرب مصر، ولاتخرب مصر حتی تخرب البصرة، خراب البصرة من الغرق، خراب مصر من جفاف النیل '' زمین پر تباہی وفساد پھیلے گا یہاں تک کہ مصر پر افتاد پڑے گی، مصر نہیں تباہ ہوگا یہاں تک کہ بصرہ تباہ ہوجائے، بصرہ کی تباہی ڈوبنے سے ہوگی، مصر کی تباہی نیل کے سوکھنے سے ہوگی''۔

مختلف الفاظ کم وبیش اس روایت کے ذکر ہوئے ہیں، دیگر روایات کی طرح یہ بھی سنداً ضعیف ہے، تاہم دو باتیں اس روایت کی روشنی میں بہت قابل غور ہیں، ایک یہ کہ مصر کی تباہی وویرانی سے پہلے بصرہ تباہ ہوگا، اور دوسرے یہ کہ مصر کی تباہی دراصل ''نیل'' کے سوکھنے سے ہوگی، ہم اس سے پہلے یہ ذکر کرچکے ہیں کہ احادیث فتن میں اشاراتی زبان ہوتی ہے، اب اوپر مذکور روایت کے الفاظ ''تفت مصر فت البعرة '' کا موازنہ ''جفاف النیل'' سے کیجئے تو صاف نظر آئے گا کہ اونٹ کی مینگنی خشک ہونے کے بعد مزید ٹوٹ کر بکھر جاتی ہے، اور اس روشنی میں ایسا لگتا ہے کہ مصر کے خلاف بیرونی سازشوں کا ''نیل'' کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔

حقائق یہ کہتے ہیں کہ اسرائیل کا توراتی وصہیونی نقطہ نظر یہ ہے کہ اسرائیل کی سرحدیں ''نیل سے فرات تک'' ہیں، یہ توراتی نظریہ ہے، اسی کی بنیاد پر جدید صہیونیت کے بانی ومؤسس ''تھیوڈر ہرزل'' نے ''عظیم اسرائیل'' (Greater Israel) کا خواب سجایا اور اس کا نقشہ طے کیا ہے، اس نقشہ کے مطابق فلسطین، شام، عراق، مصر، لبنان، اردن، جزیرۃ العرب اور ترکی کا کچھ حصہ ''عظیم اسرائیل'' کے حدود میں آتا ہے، مستقبل میں جو دجالی وصیہونی عالمی ریاست کا تخیل ہے اور اس کا نقشہ متعین کیا گیا ہے، اس میں ''نیل'' کو اہمیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، اب ''نیل'' کے خشک ہونے سے مصر کی تباہی ہوگی، اور ادھر یہود کے نزدیک ان کی دجالی ریاست ''نیل سے فرات'' تک ہے، یہ مستقبل کے بڑے گہرے اشارے اپنے اندر رکھتا ہے۔

یقیناً یہ روایات ضعیف ہیں، تاہم ان ممالک کی شکست وریخت کے تسلسل اور فتنوں کی ترتیب کے بہت کچھ اشارے ان روایت میں مذکور ہیں، پہلے عراق کی تباہی، پھر ملک شام کی تباہی، اس کے بعد مصر کی شکست وریخت تا آں کہ ''نیل کی خشکی'' سے مصر کی مکمل تباہی؛ یہ سب واقعات وحوادث کی وہ کڑیاں ہیں جو ارض واقع پر ایک دوسرے سے پیوست نظر آتی ہیں۔

(واللہ اعلم بالصواب)

(جاری.....)

☆☆☆

❑ تاریخ کے جھروکوں سے

''ہندوستان کے عہد ماضی میں

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری- جلد اول'' ایک مطالعہ

(مصنفہ سید صباح الدین عبدالرحمٰنؒ)

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

''ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری'' سید صباح الدین عبدالرحمٰنؒ کی ایک ایسی مایہ ناز تصنیف ہے جو مامون ومطمئن سماج کی تشکیل اور بہتر مستقبل کی تعمیر کے لئے بے حد مفید ومعاون ہے، اس موضوع پر اگر چہ کافی مواد موجود ہے لیکن اردو میں تاریخ کو کھنگال کر یکجا اس طرح کا مواد پیش کر دینے کی سعادت صباح الدین صاحب کے لیے مقدر تھی، آج کے ہندوستانی سماج کی سب سے بڑی پریشانی یہ ہے کہ اس کی فضاء میں نفرت وتعصب کا زہر گھول دیا گیا ہے، تنظیموں اور مختلف پروگراموں کے ذریعہ تو یہ کام کیا ہی گیا، مگر ان سب سے پہلے تاریخ کو مسخ کر کے، تاریخی واقعات کو ان کے سیاق وسباق سے کاٹ کر، اپنی منشاء کے مطابق ڈھال کر کے یہ کام کیا گیا، انگریزوں نے اس کام کی ابتدا کی اور برادران وطن میں سے کچھ مورخین نے ان کی اقتدا کی، آزادی کے بعد نصاب تعلیم میں بھی اسی طرح کی مسموم چیزیں شامل کی گئیں، جن کو پڑھ کر نفرت کی آگ بھڑکنا جذبات کا ابال کھانا اور انتقامی جذبات کا پیدا ہونا ناگزیر ہوجائے، مسلم حکمرانوں کو ظالم وجابر لٹیرا اور مندر شکن ثابت کیا گیا، یہ عام کیا گیا کہ مسلم حکمرانوں کے زمانے میں عدل و انصاف کا گلا گھونٹا گیا، ہزاروں کو دبایا گیا، کچلا گیا، ستایا گیا، ان کے حقوق دبائے گئے، ان کے مندر تباہ کیے گئے اور ان کو جبراً مسلمان بنایا گیا، مگر سوچیے ذرا کہ تاریخ کو بدلنے کی ہزار کوشش کے باوجود آج بھی یہ سوال منہ چڑاتا ہے کہ اگر مسلمانوں نے طویل ترین شہنشاہی حکومت کے عہد میں وہ سب کچھ کیا جس کے الزامات ان پر عائد کیے جاتے ہیں تو پھر ہندوؤں کے آثار قدیمہ کیوں کر باقی رہ گئے، لاکھوں کی تعداد میں ان کے مندر کیسے بچ گئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خود اکثریت میں کیسے رہ گئے؟ ان سوالات پر غور کیجئے تو خود بخود سمجھ میں آجائے گا کہ'' کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے''۔

سید صباح الدین نے اپنی اس کتاب میں اسی پہلو کو پیش کرنے کی کامیاب ومدلل کوشش کی ہے جس سے واضح ہوجاتا ہے کہ حقیقت کو چھپایا گیا، غلط پروپیگنڈے کیے گئے اور ملک میں نفرت پھیلا کر دلوں کو تقسیم کرنے کے لیے یہ ساری کوششیں کی گئی، اسکولی نصاب میں ہر گھولا گیا، سیریل کیے تیار کیے گئے، انگریزوں کی پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے گڈمڈ تاریخ تیار کی گئی اور اس طرح نفرت کی کھیتی کی گئی اور دھماکہ خیز ماحول تیار کیا گیا۔ مصنف گرامی نے یہ کتاب اسی لیے تیار کی کہ اس کے ذریعہ ذہنی شکوک دور کیے جاسکیں، الزامات کی حقیقت سامنے آسکے، غیر دیانتدار اور متعصب مورخین کی بد

نیتی اور بد دیانتی سے پردہ اٹھایا جا سکے، اور موانست ویگانگت کی فضا ہموار کی جا سکے، مصنف مرحوم کی یہ تاریخی اور بے مثال کوشش ہندو مسلم یگانگت اور سماجی بھائی چارے کو فروغ دینے کے لئے مفید ومعاون ہے، اس کا حق تھا کہ یہ ہندستان کی ہر زبان میں ترجمہ ہوکر شائع ہوتی۔

یہ کتاب دراصل ان کے ایک مقالے کی تفصیل ہے جو بڑھتے بڑھتے تین جلدوں میں مکمل ہوکر شائع ہوئی، جس کی بابت مصنف نے دیباچہ میں یوں اظہار کیا ہے، انھوں نے اس کتاب میں لکھا ہے:

''اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کے عہد میں صرف لڑائیاں ہی نہیں ہوتی رہیں بلکہ ان کے یہاں رواداری، فراخ دلی اور انسان دوستی بھی رہی کچھ ایسے مورخین بھی ہیں جو بعض مسلمان فرماں رواوں کے تشدد کو ان کا ذاتی فعل نہیں بلکہ اسلام کی تعلیمات سے منسوب کر دینے میں خوشی محسوس کرتے ہیں لیکن ان کی اس قسم کی تحریریں تاریخی صداقت کے بجائے سیاسی مصالح اور مذہبی غیر رواداری پر مبنی ہوتی ہیں، مسلمانوں کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ حکومت الحاد، بے دینی، کفر وشرک کے ساتھ تو عرصۂ دراز تک قائم رہ سکتی ہے مگر جبر، ظلم اور چیرہ دستی سے برقرار نہیں رکھی جا سکتی ہے، اسی لیے ہندوستان کے مسلمان فرماں رواوں نے اپنے دورِ حکومت میں عدل وانصاف پر ہر زمانہ میں زور دیا، یہ عدل پسندی اور انصاف پروری رواداری اور فراخ دلی کے بغیر عمل میں نہیں آسکتی''۔(ص۷-۸)

مصنف کا یہ دیباچہ ص ۷ سے ص ۱۴ تک پھیلا ہوا ہے، اس میں انھوں نے رواداری سے متعلق قرآن وحدیث کی تعلیمات کو بڑی خوبصورتی واختصار سے بیان کیا ہے، ایک جگہ دین میں جبر نہ ہونے کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''موجودہ عہد ازم کا ہے، بولشویزم، فاسزم، کمیونزم اور سوشلزم کے حامی اپنے اپنے نظریوں کے منوانے کی خاطر کیا کیا تشدد کو راہ نہیں دے رہے ہیں، انڈو چائنا میں نظریوں کی جنگ گزشتہ تیس سال سے لڑی جارہی ہے، لندن کے اخبار ٹائمس کے مطابق اس جنگ میں اکیس لاکھ چھبیس ہزار دوسو چوالیس افراد مارے جاچکے ہیں۔ مگر اسلام کی تعلیم یہ رہی ہے کہ نظر وفکر کیا دین میں بھی جبر نہیں، سورۂ بقرہ میں ہے کہ دین میں زبردستی نہیں، راہ درست گمرہی سے علانیہ ممتاز ہو چکی ہے۔ بقرہ، ع۳۴''۔(ص۹)

آگے مصنف نے دیباچہ کے ص۱۳ پر یہ بھی لکھا ہے:

''اس کی ان تعلیمات اور روایات کی خلاف ورزی ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں نے کی تو وہ ضرور قابل مواخذہ ہیں مگر جو مورخین ان خلاف ورزیوں کو ان کے بجائے اسلام سے منسوب کرتے ہیں وہ بھی قابل مواخذہ ہیں، ایسے مورخین وہی ہیں جو دلوں کو جوڑنے کے بجائے دلوں کے توڑنے میں لذت محسوس کرتے ہیں''۔(ص۱۳)

آخر میں انھوں نے اپنی نیک نیتی کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''زیر نظر کتاب دلوں کو جوڑنے کے لیے مرتب کی گئی ہے، اس میں نفرت وعداوت کے جذبات ابھارنے کے بجائے محبت ویگانگت کی خوشگوار لہر دوڑتی نظر آئے گی''۔(ص۱۴)

ص ۱۵ سے تمہید شروع ہوتی ہے، جس میں

مصنف نے بیان کیا ہے کہ اس کتاب کا موضوع کیا ہے اور کیوں ہے، انھوں نے عہد ماضی سے مراد وہ عہد لیا ہے جس عہد میں ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت رہی، انھوں نے یہ ثابت کرنے کے لیے یہ موضوع اختیار کیا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان صرف استیلا واقتدار کی جنگ رہی یا پھر دونوں میں فراخدلی، رواداری اور بے تعصبی بھی پائی گئی، کیوں کہ مسلمان جب اس ملک میں آئے تو ان کو جن لوگوں سے سابقہ پڑا وہ ان کے ہم مذہب نہ تھے، مصنف نے ۱۵۱ صفحات پر مشتمل اس **جلد اول** میں عہد مغلیہ سے قبل کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کو پیش کیا ہے، مصنف کے نزدیک:

''تاریخ کے مواد کچے ہوتے ہیں، وہ دلوں کو توڑنے اور جوڑنے دونوں کے لیے استعمال کیے جا سکتے ہیں کسی ملک کے کسی دور کی صرف خونریزی اور ہولناکی کی داستانیں جمع کردی جائیں تو اس کی تاریخ یقیناً قصائی کی دوکان ہوجائے گی لیکن اس عہد میں ایسے بہت کچھ مواد ملیں گے جن سے مہر ومحبت کی داستانیں، دلجوئی اور دلنوازی کی حکایتیں قلمبند کی جائیں تو اسی عہد کی تاریخ دلآزار ہونے کے بجائے دلنواز بن جائے، مورخ کا قلم بھی عجیب ہوتا ہے، یہ شعلہ بھی ہے اور شبنم بھی، کانٹا بھی ہے پھول بھی، زہر بھی ہے تریاق بھی، پیار وچُمکار بھی ہے تو نفرت و عداوت کی تلواروں کی جھنکار بھی، یہ کلیجہ کو چھید کر کے لاعلاج ناسور بھی پیدا کرسکتا ہے تو دلوں کو سرور بھی بخش سکتا ہے''۔(ص۱۵)

اس تمہید کے بعد کا عنوان ہے **لڑائیوں کی سیہ کاریاں**، مصنف نے اس میں مسلمانوں کے ذریعہ لڑی گئی لڑائیوں کا اعتراف کیا ہے، خونریزی اور بعض علاقوں میں غارت گری کا بھی اعتراف کیا ہے، مگر ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے، ''ان کے مورخین اپنے فاتحانہ غرور اور جنگ جویانہ ذہن سے ایسی باتیں بھی لکھ گئے ہیں جن سے غیر مسلموں میں اشتعال بھی پیدا ہوتا ہے اور دکھ بھی..... (ص۴۱۶)۔ اس جرات مندانہ اظہار حقیقت کے بعد انھوں نے یہ بھی لکھا کہ اور بجا لکھا ہے کہ اگر مسلم حکمرانوں کی جنگوں کی سیہ کاریاں اور غیروں کی جنگی تباہیوں کا موازنہ کیا جائے تو مسلمانوں کے مظالم بے حیثیت نظر آتے ہیں، اس ضمن میں انھوں نے کچھ مثالیں پیش کی ہیں اور پھر یہ حقیقت پسندانہ مجلّہ لکھا ہے، ''ظلم بہرحال ظلم ہے، ظلم میں زیادہ اور کم کا سوال نہیں ہوتا''، مگر وہ اس حقیقت کا اظہار کیے بغیر بھی نہ رہ سکے ہیں کہ اگر کسی حکومت کی جنگی قہر مانی وستم آرائی اور اس کے جبر واستبداد کے مقابلہ اس کے عدل وانصاف، رواداری، فیاضی وفراخدلی اور انسانیت نوازی کا پلڑا بھاری ہے تو اس کو یقیناً قابل تعریف قرار دیا جائے گا۔

مصنف نے اسی قابل تعریف پہلو کو پیش کرنے کے لئے **ہندوستان سے عربوں کا لگاؤ** عنوان باندھا ہے، اور لکھا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی باقاعدہ تاریخ کا آغاز تو عربوں کی آمد سے ہوتا ہے، لیکن عربوں کو اس ملک سے زمانۂ جاہلیت میں بھی لگاؤ تھا، مصنف نے اس دعوے کی کئی دلیلیں پیش کی ہیں، مثلاً ان کی خواتین میں ہندہ نام کا پایا جانا، ان کے یہاں ہندوستانی اشیاء کا تذکرہ ہونا مثلاً ہندی تلوار، صندل، عود وغیرہ، مصنف نے حضرت سید صاحب کے حوالے سے لکھا ہے کہ قرآن مجید میں اس ملک کی تین خوشبوؤں مسک، زنجبیل، کافور کا ذکر جنت کی تعریف میں ملتا ہے یہاں وہ عربوں کی ابتدائی آمد کا تذکرہ کرنے کے بعد **محمد بن قاسم** کی مہم کا ذکر کرتے ہیں، اس موضوع پر لکھتے ہوئے مصنف نے اس مہم کا ایک سبب یہ ذکر کیا ہے کہ عرب تاجر ادھر کے علاقوں میں آتے تھے، بحری قزاقوں سے ان کو محفوظ کرنے کے لئے ۷۰۵ء کے زمانے میں حجاج بن یوسف کے حکم پر محمد بن قاسم نے فارس

سے سندھ کی طرف پیش قدمی کی، صاحب کتاب کا کہنا ہے کہ جنگ تو بہرحال جنگ ہوتی ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ خوں ریز اور ہولناک جنگ کے بعد ان فاتحین عرب نے یہاں کے لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کیا، یہاں مصنف نے حجاج بن یوسف نے جو کہ تاریخ میں ایک جابر وظالم حکمراں کے نام سے مشہور ہے اس کی ایک نصیحت نقل کی ہے، اس کا ایک حصہ یہاں نقل کرنا ناگزیر ہے:

''جو مال، متاع، ہاتھی، گھوڑے تمہارے ہاتھ آئیں ان کو تم اپنی ملکیت نہ سمجھو، تاکہ تم اپنے یاروں میں نیک نام رہو، ہر ایک کا احترام کرو اور سب کی دلدہی میں لگے رہو، لشکر کو جن چیزوں کی احتیاج ہو اس کو رفع کرنے کی کوشش کرو، جب علاقہ پر حکومت یقینی ہو جائے اور قلعے محفوظ ہو جائیں تو جو کچھ بچے اس کو رعایا کی رفاہ اور بہبود میں خرچ کرنے میں دریغ نہ کرو، ان کے کھانے پینے کا پورا انتظام کرو، سپاہیوں کو مال غنیمت بھی دو اور ایسی فیاضی کرتے رہو کہ لشکر میں غلہ ارزاں ہو، کاشتکاروں او رتاجروں کے سامنے ہر قسم کی رعایت کرو کیوں کہ ان کی مرفہ حالی اور آسودگی سے ملک مزروع اور آباد رہتا ہے اور اس طرح وہ تمہاری بھی طرف مائل رہیں گے''۔(ص۱۹)

''جو کوئی تم سے اقطاع یا ولایت کا طلب گار ہو تو اس کو ناامید نہ کرو، اس کے التماس کو قبول کرو، رعایا کو امان دے کر ان کے دلوں کو مضبوط کرو، باشاہی کے چار ارکان ہیں: ا۔ مدارا (یعنی خاطر داری)، مسواساۃ (دلجوئی، مسامحت (ہمدردی)، مصاہرت (رشتہ داری)، ۲۔ مال اور عطیہ کا لینا دینا۔ ۳۔ دشمنوں کی مخالفت میں صحیح رائے قائم کرنا۔ ۴۔ رعب، مہابت، شہامت، قوت اور شوکت کا اظہار کرنا، ان باتوں سے دشمنوں کو زیر کرنا چاہیے، راجہ جس بات کا التماس کریں اس کا پورا عہد کر کے ان کو راہ پر لاؤ، جب وہ خدمت کے لیے آمادگی کا اظہار کریں اور مال گزاری خزانے میں ادا کرتے رہیں تو ان کو ہر طرح کی قوت پہنچاتے رہو، دشمنوں کے مکرو فریب سے بچتے رہو،..... مسلمانوں کا کوئی سفیر کہیں بھیجو تو اس کا مذہبی عقیدہ درست ہونا چاہیے تاکہ وہ ہر بات کو رعب کے ساتھ جھجک کے بغیر کہہ سکے،..... جو شخص وحدانیت الٰہی کا اقرار کرے اور تمہاری اطاعت قبول کرلے تو اس کے تمام مال و اسباب، علاقے زمین اور کھیتی کو برقرار رکھو اور جو اسلام قبول نہ کریں ان کو اسی حد تک گزند پہنچاؤ کہ وہ مطیع ہو جائیں جو لوگ تمرد اختیار کریں تو ان سے لڑنے کے لیے تیار رہو، ایسی جگہ جا کر لڑو جہاں زمین کشادہ ہو تاکہ مرد مرد کے ساتھ اور سوار سوار کے ساتھ میدان میں جولانیاں کر سکیں، جب لڑائی میں مصروف ہو جاؤ تو کرم الٰہی پر توکل کرو''،(ص۲۰)

مصنف نے یہاں <u>محمد بن قاسم کے فیاضانہ برتاؤ</u>، <u>مفتوحین سے حسن سلوک</u> وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے اور تاریخی حوالوں سے لکھا ہے کہ محمد بن قاسم نے کسی طرح رواداری اور فراخدلی کا ثبوت دیا کہ لوگ اطاعت کرتے گئے اور اسلام قبول کرتے گئے، <u>ضرورت سے زیادہ رواداری پر حجاج بن یوسف نے اس کو متنبہ</u> بھی کیا اور تنبیہ کرتے ہوئے یہاں تک لکھا کہ ''تم دشمنوں کو امان دینے میں بڑے حریص ہو گئے ہو، یہ امر مجھ کو مکروہ معلوم ہوتا ہے، جس دشمن کی عداوت کا امتحان ہو چکا ہو اس کو امان دینا مناسب نہیں، وضیع اور شریف کو ایک سطح پر نہیں رکھنا چاہیے، عقل سے اس طرح کام انجام دو کہ دشمنوں کو تمہارے عجز کا خیال نہ ہو .....ص۲۴''، محمد بن قاسم کی یہی رواداری تھی کہ اس کے ساتھ

ٹھاکروں اور جاٹوں نے تعاون کیا، راجہ داہر کے وزیر کی عزت افزائی کی تو وہ اسی کا ہوکر رہ گیا اور سارے راز اگل دیے، ایک روز اس وزیر جس کا نام سی سا کر اس نے تھا محمد بن قاسم سے کہا:

''اے امیر عادل! آپ نے زمین کی مالگذاری قدیم رسم ورواج کے مطابق مقرر کی ہے، اس میں دست درازی نہیں ہوتی ہے، رعایا کی گردن پر کسی محمول کا بوجھ نہیں ڈالا گیا ہے، اس سے رعیت نہایت خوش ہے، رعایا نوازی اور عدل گستری کا ایسا آئین ودستور ہے جس سے سارے دشمن پامال ہوں گے، رعایا خوش رہے گی اور ملک فتح ہوگا۔'' (ص ۲۵-۲۶)

''مصنف نے برہمن آباد کے باشندوں اور برہمنوں کے ساتھ حسن سلوک کی مثالیں پیش کی ہیں، برہمنوں کی ایمانداری پر بھروسہ کرنے کے واقعات نقل کیا ہے، یہاں تک لکھا ہے کہ ''محمد بن قاسم برہمنوں کی طرف مائل ہوا ان کو بڑے عہدوں پر فائز کیا کیوں کہ اس کو خیال پیدا ہوگیا تھا کہ یہ ایمان دار ہوتے ہیں.....ص ۲۷''۔

محمد بن قاسم نے عام لوگوں کے ساتھ نرمی برتی، مندر میں عبادت کی عام اجازت دی گئی، مصنف نے اس سلسلہ میں حجاج کے فرمان کا ذکر کیا ہے:

''حالات معلوم ہوئے، اگر برہمن آباد کے مقدم اپنا مندر بنانا چاہتے ہیں تو اب جب کہ انھوں نے ہماری اطاعت قبول کرلی ہے اور دارالخلافت میں مال کے ادا کرنے کا ذمہ لے لیا ہے تو اس مال کے علاوہ ان پر ہمارا کوئی اور حق نہیں، جب وہ ذمی ہوگئے ہیں تو ان کے جان ومال میں کسی طرح کا تصرف صحیح نہیں، ان کو اجازت دی جائے کہ وہ اپنے معبود کی عبادت کریں، مذہب کی پیروی میں کسی شخص پر زجر نہ کیا جائے تاکہ وہ اپنے گھر میں جس طرح چاہے رہے''۔ (ص ۲۹)

پرانے مراسم کا تحفظ کیا گیا، رعیت نوازی کی تلقین کی گئی، ملک میں بسنے والے صنعت کاروں، تاجروں اور کسانوں کی حوصلہ افزائی کی گئی، یہ بات ملحوظ رہنا چاہیے کہ اس کتاب میں مصنف نے جذبۂ خیر سگالی اور باہمی منافرت کو دور کرنے نیز جذبۂ باہمی کو فروغ دینے کے لئے مسلم حکمرانوں کی رواداری کے واقعات کو پیش کیا ہے، اس لیے بسا اوقات اس میں رواداری کے ان واقعات کا ذکر بھی ملتا ہے جو شرعی حدود تجاوز کر جانے سے بھی تعلق رکھتے ہیں، لیکن یہاں ان کے شرعی یا غیر شرعی ہونے سے متعلق ہم کو بحث ہمارا موضوع نہیں ہے، البتہ ایسے بعض واقعات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں رواداری وفراخدلی اور انسانیت نوازی کے واقعات سے سبق حاصل کرنا ہے، اس سلسلہ کا ایک واقعہ مصنف نے مقامی باشندوں کے ناچ پر انعام دینے کا ذکر کیا ہے جس میں محمد بن قاسم کے خوش ہوکر ناچ پر انعام دینے کا تذکرہ ہے، اس کے بعد مصنف نے راجہ داہر کی رانی کے تعاون کا تذکرہ کیا ہے، جس کا تعلق پڑھنے سے ہے، ظاہر ہے کہ ہم یہاں اس کتاب کی تمام تفصیلات نہیں نقل کرسکتے۔

''جنگوں کا دستور رہا ہے کہ فاتح لشکر فوجیوں اور عام شہریوں میں تمیز نہیں کرتے، سب کو ہلاک کرتے ہیں، غیر مسلم فاتحین کی اس حرکت پر قرآن نے بھی ملکہ سبا کی زبان سے تبصرہ کیا ہے، اس سلسلہ میں عالمی قانون بھی بنایا گیا ہے جس کی دھجیاں اڑتے ہم شام ویمن وعراق اور افغانستان میں روز دیکھتے ہیں مگر یہ محمد بن قاسم ایک مسلمان فاتح تھا جس نے قلعہ کے ایک مندر (نو بہار) میں داخل ہوکر

اعلان کیا تھا کہ ''غیر فوجی لوگوں کو امان دی جائے اور جو شخص مقابلہ کرے اس کو ہلاک کیا جائے۔ص ۳۲''۔

معاہدے کی پابندی کا احترام کرنے سے متعلق جو واقعہ نقل کیا گیا ہے اس کا نقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے:

''مقابلہ کرنے والوں میں ایک شخص آگے بڑھ کر بولا کہ میں ایک عجیب بات ظاہر کرنا چاہتا ہوں جو میں امیر کے سامنے ظاہر کروں گا، وہ محمد بن قاسم کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے کہا کہ میں اس شرط پر ظاہر کروں گا کہ میرے اہل وعیال کے ساتھ مجھ کو بھی امان دی جائے، محمد بن قاسم نے کہا میں نے تجھ کو امان دی، اس نے پھر کہا کہ امان نامہ عنایت ہو اور اس پر دستخط ہوں، محمد بن قاسم کو خیال ہوا کہ شاید اس کے پاس بیش قیمت جواہرات یا زیورات ہوں، اس لئے امان نامہ پر دستخط کر کے اس کے ہاتھ میں دے دیا، اس کے بعد اس شخص نے اپنی داڑھی اور مونچھوں اور بالوں کو دراز کیا، اپنے پاؤں کی انگولیاں سر سے لگائیں پھر رقص کرنے لگا اور یہ کہتا جاتا تھا کہ ایسی عجیب بات کبھی ظاہر نہیں ہوئی ہوگی، محمد بن قاسم کو تعجب ہوا کہ یہ کون سی عجیب بات ظاہر کرنے کے لائق تھی، لشکریوں نے کہا کہ اس نے فریب دیا، اس کو امان نہ دی جائے مگر محمد بن قاسم نے کہا کہ قول قول ہے اور عہد عہد ہے، اس سے پھرنا بڑے آدمیوں کا کام نہیں، اس کو ہلاک کرنے کے بجائے قید میں رکھا جائے اور حجاج کا بھی فیصلہ معلوم کیا جائے، اس کو اس کے خاندان کے بائیس آدمیوں کے ساتھ قید خانہ بھیج دیا گیا، حجاج کو اس معاملہ کی خبر بھیجی گئی تو اس نے علما کا فتویٰ لے کر یہ حکم بھیجا کہ اس آدمی کو آزاد کر دیا جائے تا کہ معاہدہ کی خلاف ورزی نہ ہو''۔(ص ۳۲)

مصنف نے بعض اور اہم واقعات نقل کرنے کے بعد محمد بن قاسم کی گرفتاری کے اسباب پر مختصر اروشنی ڈالی ہے پھر اسکی بحالت قید موت پر سندھ کے لوگوں کے ماتم کی تصویر کشی کی ہے، اس کے بعد اس کے کارناموں پر تبصرہ کیا ہے، یہاں انھوں نے بعض ان مورخین کے اقتباسات بھی نقل کیے ہیں جن کا شمار انتہائی متعصب مورخین میں ہوتا ہے، چنانچہ جدو ناتھ سرکار کا یہ تبصرہ ملاحظہ کیجئے:

''شروع کے عرب فاتحوں خصوصا سندھ کے فاتحوں نے یہ عقلمندانہ اور مفید حکمت عملی اختیار کر رکھی تھی کہ وہ غیر مسلموں کی عبادت گاہوں اور مذہبی مراسم کو مطلق نہ چھیڑتے جب وہ کسی شہر پر قبضہ کر لیتے تو وہاں کی غیر مسلم آبادی کو اسلام قبول کرنے کو کہتے، اگر وہ قبول کر لیتے تو ان کو وہی حقوق حاصل ہو جاتے جو فاتحوں کو ہوتے، ورنہ پھر ان کو جزیہ ادا کرنا پڑتا جس کے بعد ان کو اپنے مذہب کے مراسم ادا کرنے کی آزادی ہوتی''۔(ص ۳۵)

اسی ضمن میں پروفیسر ایشوری کے تبصرے کا ایک حصہ ملاحظہ کیجیے:

''ان عرب سپاہیوں کے علاوہ محمد بن قاسم نے اپنے جھنڈوں کے نیچے ان جاٹوں اور میدیوں کو جمع کیا جو ہندوؤں کی غیر روادارانہ حکومت سے عاجز تھے اور بہت ذلت برداشت کر رہے تھے، وہ گھوڑے پر سوار نہیں ہو سکتے تھے، ان کو اچھے کپڑے پہننے کی ممانعت تھی، ان کو ننگے سر رہنے کا حکم تھا ان ذلتوں سے وہ محض لکڑہارے اور پن بھرے بن کر رہ گئے تھے، ان کے دلوں میں ایسا عناد بھرا ہوا تھا کہ انھوں نے اپنی قسمت کو فوراً ایک اجنبی کے سپرد کر دیا''۔

(ص۳۶)

عربوں کی عام رواداری پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے ڈاکٹر بینی پرشاد کا اقتباس نقل کیا ہے:

''ہندوستان میں کسی حکومت کے مقبول ہونے کے لیے ایک ضروری شرط یہ بھی ہے کہ اس کے باشندوں کو مذہبی فرائض انجام دینے اور عبادت کرنے میں آزادی ہو، ہندوستان کے مسلم حملہ آوروں نے مذہبی رواداری کی اہمیت کو بہت جلد محسوس کر لیا تھا اور اپنی حکمت عملی اسی کے مطابق بنائی، آٹھویں صدی میں محمد بن قاسم نے سندھ میں اپنی حکومت کا جو نظم ونسق قائم کیا وہ اعتدال اور رواداری کی روشن مثال ہے''۔(ص۳۷)

اس کے بعد مصنف نے <u>لڑائی کے موقع پر اسلام کی تعلیمات</u> پیش کی ہیں، اور پھر اس حقیقت کا مکرر وسہ کرر اظہار کیا ہے کہ اگر مسلمانوں نے کبھی کبھی ان تعلیمات سے انحراف کیا اور سفاکیت کا مظاہرہ کیا تو اس کے لیے اسلام کو موردالزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا، انھوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ مسلمانوں کی تلواریں حکومت کے نظم ونسق کے لیے تو نیام سے باہر نکلیں مگر اشاعت اسلام کے لیے ان کا استعمال کبھی نہیں ہوا، یہاں انھوں نے ام پنکر کا ایک اقتباس نقل کیا ہے:

''فتح وتسخیر کے زمانے میں تو ہندوؤں کو صعوبتوں اور مصیبتوں میں مبتلا ہونا پڑا، وہ یکا یک بڑے علاقے سے اپنے سیاسی اقتدار سے محروم کر دیے گئے، ان کے مذہب کو بھی تحقیر سے دیکھا گیا اور ان کی عبادت گاہیں بھی برباد کی گئیں لیکن جوں ہی فتح وکامرانی کا جوش ختم ہوتا ملک کی اقتصادی بحالی کا مسئلہ سامنے آتا تو بڑے بڑے پر جوش اور متعصب سلاطین کو بھی معتدل روش اختیار کرنی پڑتی، مسلمان حملہ آور اپنے ساتھ کاشتکار نہیں لائے تھے، دہلی پر فوج کے ذریعہ قبضہ ہی ہوا تھا، اور فوج ہی نے گنگا کی وادی کے راجاؤں کی کو شکست دی تھی، مسلمان سلاطین کے لیے لشکریوں کے ذریعہ زمین کی کاشت کرانا ممکن نہ تھا، زمین امرا میں جاگیر کے طور پر ضرور تقسیم کر دی گئی تھی لیکن کاشتکار ہندو ہی رہے، اس کی کبھی فکر نہیں کی گئی کہ ہندو زمین داروں اور کاشت کاروں کو مسلمان بنا لیا جائے اور نہ اشاعتِ اسلام کی کبھی کوشش کی گئی کیوں کہ دوآبہ میں مسلمانوں کی حکومت سات سو برس رہی لیکن یہاں اب بھی ہندو ہی کی غیر معمولی اکثریت ہے، نظام آراضی میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی گئی، اس لیے گاؤں میں ہندوؤں کی زندگی ویسی ہی رہی جیسی کہ پہلے تھی۔''(ص۳۹-۴۰)

اس کے بعد مصنف نے <u>ہندوستان سے عرب انشا پردازوں مورخوں اور سیاحوں کی</u> محبت پر روشنی ڈالی ہے، پھر عربوں کے اچھے تاثرات کا تذکرہ کیا ہے، پھر ایک بڑا دلچسپ سوالیہ عنوان قائم کیا ہے کہ <u>کیا محمود غزنوی میں رواداری نہ تھی</u> یہ عنوان اس لیے دلچسپ اور اہمیت کا حامل ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں جن حکمرانوں کا نام لے کر سب سے زیادہ نفرت کے جذبات عام کیے گئے ان میں محمود غزنوی، بابر واورنگ زیب سر فہرست ہے، مصنف نے اس باب میں مورخانہ شان کے ساتھ مدلل اور غیر معمولی جواب فراہم کیا ہیں، جس کو مکمل پڑھا جائے تو تصویر صاف ہوتی نظر آتی ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ غزنوی کے ذریعہ سومناتھ کے مندر کو تباہ کیے جانے کی بابت بڑی کہانیاں سنائی جاتی ہیں مگر اس کے حالات زندگی سے یہ حصہ نکال کر نہیں بیان کیا جاتا کہ:

''جب اس نے متھرا کا مندر دیکھا تو اس کی شوکت وحشمت دیکھ کر ششدر رہ گیا، اپنے ایک مکتوب میں لکھتا ہے کہ اگر کوئی ایسی عمارت بنان

اچا ہے تو لاکھوں سرخ دینار خرچ کر کے بھی نہیں، بنا سکتا ہے اور شاید سو برس میں بھی ایسی عمارت نہ بن سکے۔ (تاریخ یمینی بحوالہ الیٹ جلد دوم ص۴۴) یہاں وہ نہ بت شکن بنا اور بت فروش بلکہ اس مندر کے حسن وشوکت سے متاثر رہا، اس کی کوئی مثال نہیں کہ اس نے امن کی حالت میں کسی مندر کو منہدم کیا یا اس نے کسی ہندو کو ترک مذہب کرنے پر مجبور کیا، بلکہ غزنہ میں تو اس نے ہندوؤں کی بود وباش کے لیے ایک محلّہ بھی آباد کر دیا تھا''۔ص۴۴

مصنف نے اس باب میں متعدد ہندو مورخین کے اعترافات اور ایسے تاریخ واقعات کو مدلل بیان کیا ہے جس سے غزنوی کی فراخدلی، رواداری اور حکمت عملی پر روشنی پڑتی ہے، انھوں نے سی، وی دیدیہ کی کتاب ہسٹری آف مڈیول ہندو انڈیا کی تیسری جلد سے جو اعترافات واقتباسات نقل کیے ہیں وہ بہت قیمتی اور زہر آلود فضا کو خوشگوار کرنے کے لئے بہت مفید ہیں، ان اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کس طرح امن وامان قائم کیا، تجارت کو فروغ دیا، ظلم کا خاتمہ کیا، پرامن فضا قائم کی، عوام وخواص پر یکساں قانون کا نفاذ کیا اور عدل و انصاف کی بے مثال طرح ڈالی، پروفیسر ایشوری پرشاد کا یہ اقتباس بڑا دلچسپ ہے جس کو نقل کیا گیا ہے:

''محمود نے تاریخ میں جو جگہ بنائی ہے اس کا تعین کرنا کوئی مشکل امر نہیں ہے، اپنے عہد کے مسلمانوں کی نظر میں تو وہ ایک غازی اور مذہب اسلام کا علم بردار تھا، جس نے کفر کا خاتمہ کر دینا چاہا، ہندوؤں کی نظر میں آج بھی ایک سنگدل اور ظالم لٹیرا ہے جس نے ان کی مقدس عبادت گاہوں کو ملیامیٹ کر کے ان کے مذہبی جذبات کو صدمہ پہنچایا، لیکن ایک غیر متعصب محقق اور مورخ اس کے زمانہ کی صورت حال کو پیش نظر رکھ کر کچھ اور ہی فیصلہ دینے پر مجبور ہوگا، محمود بلاشبہ اپنے ساتھیوں کا ایک جلیل القدر رہنما، ایک انصاف پسند اور دیانت دار حکمراں، ایک باکمال اور پرجوش سپاہی، عدل وانصاف کا شیدائی، علوم وفنون کا مربی تھا، وہ بلاشک وشبہ دنیا کے بہترین اور عظیم ترین حکمرانوں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے''۔(ص۵۱-۵۲)

آگے مصنف نے البیرونی کے حوالے سے جو گفتگو کی ہے وہ بڑی اہمیت کی حامل ہے، کیوں کہ ایک طرف تو محمود غزنوی پر سنگین الزامات ہیں، دوسری طرف اسی کی سرپرستی میں جینے والا وہ ابوریحان بیرونی ہے جو بحر العلوم تھا، اپنی کتاب الہند کے سبب وہ آج بھی زندہ وجاوداں ہے، اس نے جس دقت و عرق ریزی کے ساتھ سنسکرت سیکھی اور ہندوؤں کے علوم وفنون سے واقفیت حاصل کی وہ امر واقعہ ہے، اس کی یہ کتاب ہندوؤں کے مذہب، ان کی کتب مقدسہ ان کے رسوم ورواج، عقائد و آثار ومراسم اور تہذیب وتمدن کے تعارف کا بڑا قیمتی مخزن ہے، اس کتاب میں اس نے جس رواداری کا ثبوت دیا ہے وہ بڑا قیمتی سرمایہ ہے بقول علامہ شبلی ''یہ کتاب درحقیقت سنسکرت علوم و فنون کا نہایت عمدہ خلاصہ ہے'' (ص۵۷)۔ ان کے مطابق ہندوستان کے علوم وفنون اور رسوم وعادات پر لکھی گئیں تمام کتب اس کتاب کے سامنے بازیچۂ اطفال بن گئیں (ص۵۷)۔

مصنف نے البیرونی کے تذکرے میں جو عناوین قائم کیے ہیں ان پر نظر ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے، گفتگو کی ابتدا <u>البیرونی کی محبت کے نغمے</u> سے ہوتی ہے، پھر <u>البیرونی کے علم وفن</u> پر تبصرہ کرتے ہیں، پھر اس کی کتاب <u>کتاب الہند کو رواداری کا ایک شاہکار</u> قرار دیتے ہیں اور اس نادر تصنیف پر ایک جامع تبصرہ کرتے ہیں، اس کے بعد مصنف مرحوم البیرونی نے جس طرح خدا کی ذات وصفات سے متعلق ہندوؤں کے

عقائد کا مطالعہ کیا اس پر تبصرہ کرتے ہیں، پھر **بت پرستی کا تجزیہ** جو کچھ اس نے کیا اس کا ذکر کرتے ہیں، کتاب کے حوالے سے مصنف نے **شودروں کے ناروا سلوک پر البیرونی کی تکلیف** کو بھی بیان کیا ہے اور اس کے **عالمانہ ومنصفانہ انداز بیان** پر بھی روشنی ڈالی ہے، پرفیسر سنیتی کمار چٹرجی کے حوالے سے لکھا ہے:

''البیرونی بیرونی لوگوں میں پہلا شخص ہے جس نے ہندوستان کے علوم وفنون کو سیکھ کر نمایاں شہرت حاصل کی اور اب بھی اس کا شمار ہندی علوم وفنون کے جاننے کی صف اول میں کیے جانے کے لائق ہے، اس کے علم میں بڑی وسعت اور صداقت تھی، پھر رواداری اور حقیقت پسندی بھی تھی، اس لحاظ سے وہ بنی نوع انسان کے ان رہنماؤں میں سے ہے جو ذہن وفکر پر اثر انداز ہوئے''۔ (ص ۵۷)

آگے ان کا ایک اور اقتباس نقل کرتے ہیں:

''وہ اپنے مذہبی عقیدہ کی وجہ سے ایسے لوگوں کو نظر انداز کرنا پسند نہیں کرتا تھا جو دوسرے ماحول اور فضا میں پھلے اور پھولے، اس کی یہ رواداری، بے تعصبی بلکہ بے لاگ پن ایسا وصف ہے، جس کے لیے ہندوؤں کو اس کا ممنون ہونا چاہے اور علمی دنیا بھی اس کی شکر گذار ہے، اس کی یہ خوبی لیاقت وصلاحیت سے زیادہ قیمتی ہے''۔ (ص ۶۲)

البیرونی نے سنسکرت جاننے والوں کے لئے عربی کی کتابیں بھی ترجمہ کی ہیں، یہاں کے پتھروں اور شہروں و دریاؤں کا مطالعہ بھی پیش کیا ہے، ہندوؤں کی معاشرتی زندگی کے حالات بھی بیان کیے ہیں، اس نے ہندوں کی نفسیات اور ان کے تہذیبی رکھ رکھاؤ ان کے جھاڑ پھونک کے طریقوں کا بھی مطالعہ کیا ہے، یہ بھی عجیب بات ہے کہ اس نے ہندو عوام کے علاوہ **برہمن کی زندگی کا گہرا مطالعہ** پیش کیا ہے، ان کے شادی بیاہ کے طریقوں اور رسوم ورواج کا مطالعہ کرتے ہوئے بسا اوقات نامناسب مراسم کا دفاع بھی کیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس نے اس کتاب کے ذریعہ اپنی بے مثال کشادہ دلی اور بقول مصنف ہر ہر سطر سے بے تعصبی کا ثبوت پیش کیا ہے، اس کے نزدیک قوموں کی باہمی دوری وبیگانگی بہت مضر تھی اس لیے اس نے اس کتاب کے ذریعہ ایک دوسرے کو جاننے کی بے مثال کوشش کی، اس کی بے تعصبی اور جذبۂ باہمی فروغ دینے کی اس نادر کوشش کا اعتراف متعدد مورخین نے کیا ہے، اس باب کے آخر میں مصنف کی یہ سطریں پڑھیے:

''البیرونی قوموں کی باہمی دوری اور بے گانگی کو ایک دوسرے کے لیے بہت مضر سمجھتا رہا، اس کا یہ سمجھنا بہت صحیح تھا، کیوں کہ ایک دوسرے کی لاعلمی سے بے گانگی پیدا ہوتی ہے، بے گانگی آنکھوں کو اندھا اور کانوں کو بہرا کر دیتی ہے جس سے ذاتی، نسلی، اجتماعی اور قومی خود بینی پیدا ہوتی ہے، اس کے بعد دل آزاری، مردم بیزاری، آبرو ریزی اور خوں ریزی بھی شروع ہو جاتی ہے جس کو قومی سرخ روئی کا نام دے دیا جاتا ہے، البیرونی نے اپنی کتاب کے باب اول کے آغاز ہی میں لکھا ہے کہ بے تعلقی کی حالت میں جو چیز نہیں معلوم ہو سکتی ہے، وہ میل جول کی حالت میں ظاہر ہو جاتی ہے، اس میل جول کی فضا کو پیدا کرنے کی خاطر اس نے انتہائی عرق ریزی اور جانفشانی سے کتاب الہند لکھی، اگر ہندو اور مسلمان دونوں میں ہر زمانہ میں ایک ایک البیرونی پیدا ہوتے رہتے تو آج ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی''۔ (ص ۸۳-۸۴)

اس کے بعد مصنف نے **شہاب الدین غوری کی رواداری** کے تحت اس کے عہد کی تفصیلات بیان کی ہیں، خصوصیت کے ساتھ اس عہد کی ایک تصنیف جوامع الحکایات

ولوامع الروایات جو سدید الدین محمد عوفی کی تصنیف ہے اس کا تذکرہ کیا ہے، عین اس وقت جبکہ سلاطین مملوک اپنی فتوحات کی داستانیں رقم کر رہے تھے تو اس کتاب کا مصنف نہر والہ کے راجہ جے سنگھ کی عدل پروری، مذہبی رواداری اور راجہ گوپال کے بلند پایہ اخلاق و کردار کی داستانیں جمع کر رہا تھا، اس سے بڑھ کر اور رواداری کیا ہوگی؟؟ کیا اس دور میں جمہوریت کی علمبرداری کے ساتھ اس قدر رواداری پائی جاتی ہے، ظاہر ہے کہ جواب نفی میں ہوگا کیوں کہ عدم برداشت کی متعدد مثالیں مشاہدے میں آتی ہیں، بلکہ جارحیت پسندی کے واقعات روزانہ کے اخبار کا حصہ بنتے ہیں، یشونت سنہا اور گوری لنکیش وغیرہ کا جو انجام ہوا وہ سب جانتے ہیں۔

مصنف نے یہاں تاریخ فیروز شاہی کے مصنف ضیاء الدین برنی کی تحریروں کا بہت اچھا محاکمہ کیا ہے، ان کی بعض تحریروں کو اشتعال انگیز قرار دیا ہے، بعض امور میں ان کو اور قاضی مغیث الدین کو مورد الزام ٹھہرایا ہے، انھوں نے بہت صراحت سے لکھا ہے کہ اسلام میں انسانی برادری کے حقوق کا پورا لحاظ کیا گیا ہے، ہر حال میں منصفانہ برتاؤ کی تلقین کی گئی ہے، انھوں نے مدلل انداز میں قاضی مغیث الدین کی تردید کی ہے اور ان کے اس فیصلہ کو من گڑھت قرار دیا ہے جس سے اسلامی تعلیمات پر زد پڑتی ہے اور رواداری کی اسلامی تعلیم کٹہرے میں کھڑی ہو جاتی ہے، کیوں کہ یہ کسی کا قول نہیں ہے کہ کسی غیر قوم کو ذلیل و حقیر اور لا اعتبار سمجھا جائے لیکن ضیاء الدین برنی نے یہ من گڑھت سمجھانے کی کوشش کی ہے، دلچسپ بات یہ ہے کہ مصنف نے یہاں قاضی مغیث الدین اور ضیاء الدین کی سخت تردید کرتے ہوئے موجودہ ہندوستان کے بعض مورخین کی تحریروں سے ان کا موازنہ کیا ہے اور لکھا ہے: ''لیکن اس بیسویں صدی کے روشن خیال دور میں ہندوستان کے کچھ مؤرخین ازمنہ وسطیٰ کے سپاہیانہ تعصب سے بھی سبقت لے جانا چاہتے ہیں.....(ص۸۹)'' پھر آر سی مورندار کی اسی طرح کی ایک تحریر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قاضی مغیث الدین یا ضیاء الدین برنی نے جو تلخ باتیں کہیں وہ تو وقتی غیض و غضب پر محمول کی جا سکتی ہیں لیکن مذکورہ بالا تحریر تو صدیوں کے بعد لکھی گئی ہے اگر قاضی مغیث کی باتیں قابل مذمت ہیں تو مذکورہ بالا اس سے زیادہ قابل مذمت قرار دی جانی چاہیے، اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ایسی جو تحریریں نکلیں یا نکلتی رہی ہیں، ان کو قابل اعتنا ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے کیوں کہ آر سی، مورندار کی تحریروں سے دل شکنی ہوتی ہے تو اسی دور میں بہت سی ایسی تحریریں بھی شائع ہوئی ہیں جن سے باہمی موانست کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اسی طرح اگر ضیاء الدین برنی کے بعض بیانات سے دل آزاری ہوتی ہے تو اسی دور میں ایسے تاریخی واقعات بھی ملتے ہیں جن سے قاجی مغیث الدین کی تلقین بے معنی نظر آتی ہے بلکہ بعض ہندو راجاؤں کے متعلق امیر خسرو، عصامی اور خود ضیاء الدین برنی نے بہت اچھے الفاظ استعمال کیے ہیں اور ان سے جو خوش گوار تعلقات پیدا ہوئے اس کا ذکر لطف و لذت سے کیا ہے''۔(ص۹۰)

اس کے بعد مصنف نے <u>غیاث الدین بلبن کے عہد کی رواداری</u> پر روشنی ڈالی ہے، اس کے ضمن میں ایک عنوان <u>ہندو راجاؤں کا احترام</u> بڑا دلچسپ ہے، اسی کے ضمن میں مصنف نے اپنی اس تشویش کا بھی اظہار کیا ہے کہ

''سلاطین دہلی کے زمانے میں ہندو امرا دربار سے علاحدہ رہنے کے بجائے اس سے برابر وابستہ رہے، مگر اس دور کے مورخوں نے اس کا ذکر اس انداز میں نہیں کیا ہے جس طرح کہ ان کا مغلوں کے زمانے

میں ہوامثلاً بلبن کے جانشین معزالدین کیقباد کے دربار کے ہندوؤں کا ذکر امیر خسرو نے قران السعدین میں اس طرح کیا:

راوت ژو بیں زن وخارا شگاف
پشت بہ پشت از پے روے مصاف

راوت سے یہاں مراد غالباً راجپوت ہی ہیں، معزالدین کیقباد کے بعد کرہ کے ملک چھجو اور جلا الدین خلجی سے لڑائی ہوئی تو کوتلہ کے پرم دیو اور رائے بھیم دیو نے ملک چھجو کا ساتھ دیا۔'' (ص۹۲)

مصنف نے اس کے بعد کافی علاءالدین خلجی کے عہد میں ہندو راجاؤں کی قدر ومنزلت سے متعلق واقعات کو نقل کیا ہے، اس حقیقت کو مدلل طور پر بیان کیا ہے کہ اس کی فتوحات میں ہندو راجاؤں کا تعاون بھی اسے حاصل رہا، ہندوؤں کے مذہبی پیشواؤں کی توقیر کے تحت انھوں نے کے ایم پینکر کا ایک اقتباس نقل کیا ہے:

''علاءالدین خلجی.....ایک متعصب حکمراں سمجھا جاتا ہے لیکن اس نے ہندوؤں کے مذہبی پیشواؤں کی بڑی عزت اور توقیر کی، جینیوں کے ماخذ سے پتہ چلتا ہے کہ علاءالدین خلجی نے آچاریہ مہاسین کو کرناٹک سے اپنے دربار میں مدعو کیا اس سے مذہبی مناظرے کیے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فرقہ دیگمبر کے پیشوا پورنا چندر جو دہلی میں رہتے تھے اور سوئمبر یوگی رام چندر سوری کی پذیرائی سلطان کے یہاں بہت تھی''۔(ص۹۷)

اس اقتباس کو نقل کرنے کے بعد پھر ضیاء الدین برنی اور مغیث الدین پر نقد کیا ہے کہ انھوں نے ہندو پیشواوں کی تعظیم وتکریم دیکھ کر ان کی تذلیل کے لیے من گڑھت تیار کی لیکن عملی اعتبار سے وہ بے معنی و بے حیثیت ثابت ہوئی۔

اس کے بعد مصنف نے محمد بن تغلق کی رواداری اور فیروز شاہ تغلق کے عہد کی رواداری سے متعلق گفتگو کی ہے، فیروز شاہ تغلق پر مندر شکنی کا جو الزام ہے اس کا محاکمہ کرتے ہوئے ایشور ٹوپا کی کتاب پالی ٹیکس ان پری مغل ٹائمس کے حوالے سے یہ لکھا ہے کہ مندر ان شہروں کے تباہ ہوئے جو اس کے بسائے ہوئے تھے اور پھر وہ بدامنی کے اڈے بھی بن گئے تھے ایشور کے مطابق ان مندروں کے انہدام میں اس کے مذہبی جنون کا کوئی دخل نہیں تھا بلکہ اس نے عوام کے اخلاق سنوارنے کے لئے ایسا کیا، مصنف نے لکھا ہے کہ ایشور ٹوپا کے اس بیان کی تصدیق فتوحات فیروز شاہی سے بھی ہوتی ہے، اس مقام پر مصنف نے ایک اہم تبصرہ کیا ہے جس کو نقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے:

''اگر غیر جانب دارانہ طور پر گہرا مطالعہ کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ جب کسی زمانہ میں کہیں مندر منہدم کرائے گئے تو اس کا سبب مذہبی تعصب یا جنون نہیں رہا بلکہ یا تو ان کی دولت پر قبضہ کرنے یا ان کی سیاسی مرکزیت کو برباد کرنے یا ان کی بداخلاقی کو دور کرنے کے لیے کیا گیا، جنگ کے موقع پر ہندو مسلمان ایک دوسرے کی عبادت گاہوں کو نقصان پہنچانے میں دریغ نہ کرتے، ایسی مثالیں بہت ملیں گی کہ ہندوؤں نے مسجدوں کو شہید کرکے ان کی جگہوں پر مندر بنوا ڈالے لیکن ان میں بھی یہ مذہبی جنون نہ تھا بلکہ ان کے بجائے سیاسی اور جنگی اسباب ہوتے اور فوجی غارت گری کی زد میں عبادت گاہیں بھی آتی رہیں''۔(ص۱۰۸)

مصنف نے اس کے بعد جزیہ پر انتہائی مختصر اور جامع بحث کی ہے، جذیہ غیر مسلموں کے لیے اعتراض و اشتعال کا ایک اہم موضوع رہا ہے، مصنف کی اس بحث کی بنیاد علامہ شبلی کی جزیہ سے متعلق تحریریں ہیں، واقعہ یہ ہے کہ

علامہ شبلی نے جس طرح جزیہ کو سمجھانے کی سعی مشکور کی ہے اس کے بعد یہ واضح ہوجاتا ہے کہ جزیہ کوئی جبری ٹیکس نہیں بلکہ وہ حقوق انسانی کا ضامن ہے اس لیے اس کی مذمت نہیں کی جا سکتی، مصنف نے اس بحث میں کمال کے ساتھ جامعیت و اختصار کے ساتھ جزیہ کی حقیقت کو واضح کیا ہے اور اس پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ ''مولانا شبلی نے بیسویں صدی میں جزیہ کی حقیقت کو جس طرح سمجھایا ہے، اگر اس دور کے علماء بھی سمجھاتے رہتے تو یہ ٹیکس اشتعال انگیز نہ سمجھا جاتا.....'' (ص ۱۱۰)

مصنف نے یہاں مولانا شبلی کے حوالے سے جزیہ کے ذریعہ ذمیوں کو ادا کیے جانے والے حقوق کو نقل کیا ہے جس کی ہر شق انتہائی چشم کشا ہے، اسی تفصیل کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا شبلیؒ نے اسی سلسلہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ اسلام نے جو انتظام قائم کیا اس کے رو سے ہر مسلمان خدمت کے لیے مجبور کیا جاسکتا ہے لیکن غیر مسلم جو اسلامی حکومت کے ماتحت ہوتے ہیں ان کی حفاظت مسلمانوں کو کرنی پڑتی ہے، ان کو فوجی خدمت پر مجبور کرنے کا اسلام کو کوئی حق نہیں ہے، نہ وہ لوگ ایسی پرخطر خدمات کے لیے راضی ہو سکتے ہیں، اس لیے ضرور ہے کہ وہ اپنی محافظت کے لیے کوئی معاوضہ دیں، اسی معاوضہ کا نام جزیہ رکھا، اگر کسی موقع پر غیر قوم فوج میں شریک ہونا یا شرکت کے لیے آمادہ ہونا گوارا کرلیں تو وہ جزیہ سے بری کردیے جائیں، خود رسول اللہ ﷺ نے والی ایلہ کو جو فرمان جزیہ کا تحریر فرمایا، اس میں یہ الفاظ مندرج فرمائے یحفظوا ویمنعوا یعنی ان لوگوں کی حفاظت کی جائے اور دشمنوں سے بچائے جائیں''۔ (ص ۱۱۱)

انھوں نے اس ضمن میں یہ بھی وضاحت کی ہے کہ جزیہ صرف چند حکمرانوں کے زمانے میں ہی نافذ کیا گیا اکثر کے زمانے میں اس کو موقوف رکھا گیا جواز خود مسلم حکمرانوں کی رواداری کی دلیل ہے، اس کے باوجود اس کے اشتعال کا موضوع بننے کے سبب کی طرف انھوں نے اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کا سبب کہیں نہ کہیں فقہاء کا اختلاف رائے بھی رہا ہے۔

اس کے بعد مصنف نے **دل آزاری سے پرہیز** پر روشنی ڈالی ہے اور ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کی امتیازی شان **عدل نوازی** کو انتہائی اختصار وسلیقے سے پیش کیا ہے، انھوں نے دل آزاری سے پرہیز میں تصوف کی تعلیمات کو بطور سبب پیش کیا ہے اور اس پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ ضیاء الدین برنی جو سلسلہ چشتیہ سے منسلک تھے وہ کیسے ایسی تحریریں لکھ گئے، اس طرح سے انھوں نے انتہائی واضح انداز میں لکھا ہے کہ ہندوستان کے مسلم فرمانروا فاسق وفاجر اور شرابی ہونے کا الزام تو گوارا کرلیتے لیکن ظالم وغیر منصف کہے جائیں یہ ان کو پسند نہ تھا، نہ ہی وہ اس کو گوارا کرسکتے تھے۔

مصنف نے **تسخیر قلوب** کے تحت لکھا ہے کہ تمام صوفیاء یہاں کے مسلم فرمانرواؤں کو بلند اخلاقی، نرم خوئی اور رواداری وعدل پروری کی تلقین کرتے رہے، صوفیاء کے کردار اور حکمرانوں کے اخلاق ہی کا نتیجہ تھا کہ یہاں کے لوگ اسلام میں داخل ہوتے رہے، انھوں نے خاص طور پر امیر خسرو کی رواداری کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ مولانا ضیاء الدین برنی اگر چہ چشتیہ سلسلہ سے منسلک تھے مگر ان کی تحریروں سے اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کو نقصان پہنچا ہے، لیکن اس نقصان کی بھرپائی ان ہی کے زمانے کے بزرگ اور خواجہ نظام الدینؒ کے حلقۂ ارادت سے تعلق رکھنے والے امیر خسرو اور امیر حسن سنجری کی تحریروں سے ہوجاتی ہے، انھوں نے پھر اس سلسلہ کی تفصیلات اور بہت خوبصورت مثالیں بھی درج کی ہیں، اس

سلسلہ کو دراز کرتے ہوئے خواجہ نظام الدین اولیا کی فراخ دلی اور حسن دہلوی کی رواداری کا ذکر کیا ہے، شیخ احمد عبدالحق کی روادارانہ حکایت کے ذریعہ پنڈوہ (بنگال) کے ایک مسلمان حاکم کی رواداری کا تذکرہ کیا ہے، اس ضمن میں انھوں نے دکن کی بہمنی سلطنت کے بانی سلطان علاء الدین کی رواداری کا تذکرہ کیا ہے، اس کے بعد مصنف نے نہایت جامع تحریر علمی رواداری پر لکھی ہے اور ثابت کیا ہے کہ علمی رواداری ملک کے گوشہ گوشہ میں برتی جاتی تھی، اسی سلسلہ میں انھوں نے سلطان زین العابدین کی رواداری کا تذکرہ کیا ہے، بیراگیوں کی رواداری کو بھی سراہا ہے اور لکھا ہے کہ بیراگیوں کی تحریکوں سے جس کو بھکتی تحریک بھی کہا جاتا ہے، اس سے رواداری کی اچھی فضا پیدا ہوئی، کتاب کا یہ حصہ بڑا دلچسپ ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے، اسی ضمن میں انھوں نے کبیر داس اور کبیر داس کے چیلوں کی رواداری کا خاص تذکرہ کیا ہے۔

اس جلد کے آخر میں سلاطین دہلی کی حکومت پر ہندوؤں کے تبصرے نقل کیے ہیں، جس میں خاص طور پر ڈاکٹر تارا چند، پروفیسر سری رام شرما، پروفیسر کے، ایم پینکر، ڈاکٹر ایشوری پرشاد اور ڈاکٹر ایشور ٹوپا کا تبصرہ نقل کیا ہے، تاریخی حقائق کو سمجھنے کے لئے نفرت کے سوداگروں سے نمٹنے کے لئے، غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کے لیے اور ملک میں خوشگوار گنگا جمنی فضا کو باقی رکھنے کے لئے اس پوری کتاب کا مطالعہ انتہائی ناگزیر ہے، ہم یہاں ان تبصروں میں سے صرف ڈاکٹر تارا چند کا ایک چشم کشا تبصرہ نقل کیے دیتے ہیں جو مصنف نے ان کی کتاب ''ہندو کلچر پر اسلام کے اثرات'' سے نقل کیا ہے:

''جب مسلمانوں کی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی تو انہوں نے ہندوؤں کو مختلف عہدوں پر مقرر کرنا ضروری قرار دیا، محمود غزنوی کی فوج میں بھی بکثرت ہندو سپاہی تھے، جو اس کی حمایت میں وسط ایشیاء میں جا کر لڑے، اس کے ہندو فوجی کمانڈر تلک نے اس کے ایک مسلمان فوجی عہدیدار نیالتگین کی بغاوت فرو کی اور جب قطب الدین ایبک نے ہندوستان میں رہ کر حکومت کرنے کا فیصلہ کیا تو اس نے ملکی نظام کو چلانے کے لیے ہندوؤں ہی کو مقرر کیا، کیوں کہ ان کے بغیر سارا نظام درہم برہم ہو جاتا، مسلمان ہنرمندوں، محاسبوں اور محرروں کو اپنے ساتھ نہیں لائے تھے، ہندوؤں ہی نے ان کے لیے عمارتیں بنائیں، جن میں پرانی چیزیں نئے حالات کے مطابق شامل کی گئیں، ہندو سناروں ہی نے مسلمان حکم رانوں کے سکے ڈھالے اور ہندو محاسبوں ہی نے ان کا حساب کتاب درست کیا، پنڈتوں نے ہندو قوانین پر عمل درآمد کرانے میں ان سلاطین کو مشورے دیے اور برہمن نجومیوں کی رائے سے حکومت اور دربار کے مختلف کام انجام پاتے تھے، مسلمان ہندوستان آئے تو اس کو انھوں نے اپنا وطن بنایا، وہ ہندوؤں کے اردگرد رہتے تھے، اس لیے دائمی مخاصمت وعناد کے ساتھ ان کے لیے زندگی بسر کرنا ممکن نہ تھا، اس باہمی میل جول سے ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کی، بہت سے ہندوؤں نے اسلام قبول کر لیا تھا لیکن مذہب کی تبدیلی سے ان میں زیادہ فرق پیدا نہیں ہوا، جب مسلمانوں سے مغلوب ہو جانے کا صدمہ جاتا رہا تو ہندو مسلمان دونوں نے ایک ایسا طرز زندگی اختیار کرنے کی کوشش کی جس سے دونوں اچھے ہمسایہ کی طرح زندگی بسر کر سکیں''۔ (ص ۱۴۵)

☆☆☆

❑ خطبات

خطبۂ حجۃ الوداع عظیم الشان بین الاقوامی منشور اور عالمی دستاویز

محمد قمر الزماں ندوی
مدرسہ نور الاسلام کنڈہ پرتاپگڑھ

حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تاریخ ساز خطبہ جسے خطبۂ حجۃ الوداع کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، امت مسلمہ کے لئے یہ قیامت تک ایک آئین اور ابدی پیغام کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ خطاب مسلمانوں کی زندگی کا حصہ ہے۔

خطبۂ حجۃ الوداع ایک ایسی عظیم الشان بین الاقوامی دستاویز اور عالمی منشور ہے جو نہ صرف اپنے دور میں آگے یا پیچھے کوئی مثال نہیں رکھتا، بلکہ آج بھی انسانیت کے پاس ایسا عظیم منشور حقوق موجود نہیں ہے جسے دینی تقدس کے ساتھ نافذ کرنے کے لئے ایک عالمی جماعت یا امت کام کرنے کے لئے تیار کی گئی۔ اس کے بعض اجزا جدید دور میں دوسروں کی دستاویزات میں بھی ملتے ہیں، مگر ان کاغذی پھولوں میں عمل کی خوشبو کبھی پیدا نہ ہوسکی۔ خطبۂ حجۃ الوداع کے اساسی عقائد کے علاوہ بعض اہم اجزا ایسے ہیں جن کی قدر و قیمت سے ہماری آج کی روشن دماغ دنیا آشنا ہی نہیں۔

خطبۂ حجۃ الوداع نہایت ہی خوبی سے اس حقیقت کو اجاگر کر دیتا ہے کہ اب تک کے دو تین ہزار سالہ دور تاریخ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وہ پہلی مبارک شخصیت ہیں جو ساری انسانیت کے لئے وسیع اور جامع پیغام لے کے آئے اور ضرورت ہے کہ اس پیغام کو ایک تحریک کی شکل میں جاری کیا جائے۔ اور اس پر مبنی حکومتیں قائم کی جائیں اور پوری دنیا میں اس منشور کو پھیلایا جائے۔

خطبۂ حجۃ الوداع کو سمجھ کر پڑھنا اور زندگی کو اس ہدایت کے مطابق گزارنا ہمارے لئے ضروری ہے۔ یہ آج بھی اسی اہمیت کا حامل ہے جتنا چودہ سو سال قبل تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تاریخی خطبے میں ان انسانی حقوق و فرائض کے تصور کو اجاگر کیا، مساوات کا درس دیا، دین کی تبلیغ کا درس دیا، اور اس ابدی پیغام کو عام کرنے کی ہدایت فرمائی، حج کے دن نبی کریم میدان عرفات میں تشریف فرما تھے۔ جب سورج ڈھلنے لگا تو آپ نے اپنی اونٹنی قصواء، کو لانے کا حکم فرمایا ،اونٹنی حاضر کی گئی۔ آپ اس پر سوار ہو کر تشریف فرما ہوئے اور خطبہ ارشاد فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتے ہوئے آپ نے خطبہ کی ابتدا فرمائی: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ یکتا ہے کوئی اس کا شریک نہیں، اللہ نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اس نے اپنے بندے (رسول) کی مدد فرمائی اور تنہا اسی کی ذات نے باطل کی ساری مجتمع طاقتوں کو زیر کیا۔ لوگو، میری بات سنو، میں نہیں سمجھتا کہ آئندہ کبھی اس طرح کی مجلس میں یکجا ہوسکیں گے۔ لوگو! اللہ کا ارشاد ہے: اِنسانوں کو ہم نے ایک ہی مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور تم سب کو جماعتوں اور قبیلوں میں بانٹ دیا ہے کہ تم الگ الگ پہچانے جا سکو، تم میں زیادہ عزت والا اور کرامت والا اللہ کی نظر میں وہی ہے جو اللہ سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔

چنانچہ نہ کسی عربی کو عجمی پر کوئی فوقیت حاصل ہے نہ کالا گورے سے افضل، نہ گورا کالے سے، ہاں بزرگی اور فضیلت کا معیار ہے تو وہ تقوی ہے۔ انسان سارے ہی آدم کی اولاد ہیں اور آدم کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ وہ مٹی سے بنائے گئے۔ اب فضیلت و برتری کے سارے دعوے، خون و مال کے سارے مطالبے اور سارے انتقام میرے پاوں تلے روندے جا چکے ہیں، بس بیت اللہ کی تولیت اور حاجیوں کی پانی پلانے کی خدمات علی حالہ باقی رہیں گی۔

قریش کے لوگو! ایسا نہ ہو کہ ایک دن تم اللہ کے سامنے اس طرح آو کہ تمہاری گردنوں پر تو دنیا کا بوجھ لدا ہو اور دوسرے لوگ سامان آخرت لے کر پہنچیں، اور ایسا ہوا تو میں اللہ کے سامنے تمہارے کچھ کام نہ آسکوں گا۔

قریش کے لوگو! اللہ نے تمہاری جھوٹی نخوت کو ختم کر ڈالا۔ اور باپ دادا کے کارناموں پر تمہارے فخر و مباہات کی گنجائش نہیں۔ لوگو! تمہارے خون و مال اور عزتیں ایک دوسرے پر حرام کر دی گئیں، ہمیشہ کے لئے، ان چیزوں کی حرمت ایسی ہی ہے جیسے تمہارے لئے اس دن کی اور اس ماہ (ذی الحجہ) کی خاص کر اس شہر میں ہے۔ تم سب اللہ کے حضور پیش ہوگے اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس فرمائے گا۔

لوگو! دیکھو کہیں میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ آپس میں کشت وخون کرنے لگو۔ اگر کسی کے پاس امانت رکھوائی جائے تو وہ اس بات کا پابند ہے کہ امانت رکھوانے والے کو امانت پہنچا دے۔ لوگو! ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ اپنے غلاموں کا خیال رکھو، ہاں غلاموں کا خیال رکھو، انہیں وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو۔ ایسا ہی پہناو جیسا تم پہنتے ہو۔ دور جاہلیت کا دستور میں نے اپنے پیروں سے روند دیا۔

زمانۂ جاہلیت کے خون کے سارے انتقام اب کالعدم ہیں۔ پہلا انتقام جسے میں کالعدم قرار دیتا ہوں، میرے اپنے خاندان کا ہے۔ ربیعہ بن الحارث کے دودھ پیتے بیٹے کا خون، جسے ہذیل نے مار ڈالا تھا، اب میں معاف کرتا ہوں۔ دور جاہلیت کا سود اب کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ پہلا سود جسے میں باطل قرار دیتا ہوں میرے چچا عباس بن عبدالمطلب کے خاندان کا سود ہے۔ اب یہ سود ختم ہو گیا۔

لوگو! اللہ نے ہر حقدار کو اس کا حق دے دیا، اب کوئی کسی وارث کے حق کے لئے وصیت نہ کرے۔ بچہ اس کی طرف منسوب کیا جائے گا جس کے بستر پر پیدا ہوا۔ جس سے حرام کاری ثابت ہو اس کی سزا سنگساری ہے۔ حساب و کتاب اللہ کے ہاں ہوگا۔ جو کوئی اپنا نسب بدلے گا یا کوئی غلام اپنے مالک کے مقابلے میں کسی اور کو اپنا مالک ظاہر کرے گا اس پر اللہ کی لعنت ہے۔

قرض قابل ادا ہے۔ عاریت لی ہوئی چیز واپس کرنی چاہیے۔ تحفے کا بدلہ دینا چاہیے اور جو کوئی ضامن ہے وہ تاوان ادا کرے۔ کسی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے کچھ لے، سوائے اس کے جس پر اس کا بھائی راضی ہو اور وہ خوشی خوشی دے۔ خود ایک دوسرے پر زیادتی نہ کرو۔

عورت کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے شوہر کا مال اس کی اجازت کے بغیر کسی کو دے۔ دیکھو تمہارے اوپر تمہاری عورتوں کے کچھ حقوق ہیں۔ اسی طرح ان پر تمہارے حقوق واجب ہیں۔ عورتوں کے اوپر تمہارا یہ حق ہے کہ وہ اپنے پاس کسی ایسے شخص کو نہ بلائیں جسے تم پسند نہیں کرتے۔ اور وہ ایسا کریں تو اللہ کی جانب سے اس کی اجازت ہے کہ تم انہیں معمولی سزا دو اور اگر وہ باز نہ آئیں تو انہیں اچھی طرح کھلا و پہناو۔ عورتوں سے بہتر سلوک کرو کیونکہ وہ تمہاری پابند ہیں۔ ان کے بارے میں اللہ کا لحاظ رکھو کہ تم نے انہیں اللہ کے نام پر حاصل کیا ہے اور اسی کے نام پر وہ تمہارے لئے

حلال ہوئیں۔

لوگو! میری بات غور سے سنو۔ میں نے حق تبلیغ ادا کر دیا ہے۔ میں تمہارے درمیان ایک ایسی چیز چھوڑے جا رہا ہوں کہ تم کبھی گمراہ نہ ہوسکو گے اگر اس پر قائم رہے، اور وہ اللہ کی کتاب ہے اور ہاں، دیکھو دینی معاملات میں غلو سے بچنا کہ تم سے پہلے کے لوگ ان ہی باتوں کے سبب ہلاک کر دئے گئے۔

لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو، پانچ وقت کی نماز ادا کرو، مہینے بھر کے روزے رکھو، اپنے مالوں کی زکوۃ خوش دلی سے دیتے رہو، اپنے رب کے گھر کا حج کرو اور اپنے اولوالامر کی اطاعت کرو تو اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاو گے۔

اب مجرم خود ہی اپنے جرم کا ذمہ دار ہوگا۔ اور اب نہ باپ کے بدلے بیٹا پکڑا جائے گا نہ بیٹے کا بدلہ باپ سے لیا جائے گا۔ سنو، جو لوگ یہاں موجود ہیں انہیں چاہیے کہ یہ احکام اور باتیں ان لوگوں کو بتا دیں جو یہاں نہیں ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی غیر موجود تم سے زیادہ سمجھنے اور محفوظ کرنے والا ہو۔ اور لوگو! تم سے میرے بارے میں اللہ کے یہاں سوال کیا جائے گا، بتاو تم کیا جواب دو گے؟

لوگوں نے جواب دیا کہ ہم اس بات کی شہادت دیں گے کہ آپ نے امانت دین پہنچا دی۔ اور آپ نے حق رسالت ادا فرمایا اور ہماری خیر خواہی فرمائی۔ یہ سن کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگشت شہادت آسمان کی طرف اٹھائی اور لوگوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تین مرتبہ ارشاد فرمایا:

اے لوگو! گواہ رہنا۔ اے لوگو! گواہ رہنا۔ اے لوگو! گواہ رہنا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ تفصیلی اور جامع خطبہ ۹/ ذی الحجہ ۱۰ ہجری حج کے موقع پر دیا جو حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ خطبہ کے مندرجات اور تمام شقوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ گویا اس خطبہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حقوق انسانی کا مکمل چارٹ اور نقشہ پیش فرما دیا ہے یہی در اصل انسانی حقوق کا پہلا منشور ہے اس خطبہ میں سچائی یہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حقوق انسانی سے متعلق اسلامی تعلیمات کا نچوڑ اور خلاصہ اس میں بیان فرما دیا ہے۔ اس تاریخی اور انقلابی خطبہ میں اگر حقوق انسانی کو دفعات کی شکل میں پیش کیا جائے تو بہت سے دفعات نکل سکتے ہیں۔ چند دفعات اس طرح ہیں۔

جان و مال، عزت و آبرو اور اولاد کے تحفظ کا حق

امانت کی ادائیگی، قرض کی وصولیابی اور جائیداد کے تحفظ کا حق

سود کے خاتمہ کا تاریخی اعلان

پرامن زندگی اور بقائے باہمی کا اعلان

ملکیت، عزت نفس اور منصب کے تحفظ کا حق

انسانی جان کے تحفظ اور قصاص و دیت میں برابری کا قانونی حق

انسانی مساوات کا حق اور انسانی تفاخر و طبقاتی تقسیم کے خاتمہ کا تاریخی اعلان

عورتوں کے حقوق اور ان کی رعایت کا تاریخی اعلان

غلاموں کے حقوق کا انقلابی اور عملی اعلان

عالمگیر مساوات انسانی اور بھائی چارہ کا حق

انسانیت کے منشور اعظم خطبہ حجۃ الوداع اور اس کو نافذ العمل بنانے کا اعلان

خطبہ حجۃ الوداع میں بیان کردہ انسانی حقوق کا یہ ایک سرسری جائزہ ہے ہم اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان حقوق میں کتنی گہرائی اور جامعیت ہے۔ نیز ان حقوق کا تحفظ کس طرح سے کیا گیا ہے۔

☆☆☆

❑ تعلیم و تربیت

تربیت اولاد- چند اہم گوشے

تلخیص وترجمانی
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

بچوں کو نظم و ضبط اور ادب سکھانا

چودہ سالہ حسان صوفے پر بیٹھتا ہے، ہاتھ میں میگزین لے کر پڑھنا شروع کرتا ہے اور اپنے پیر صوفے پر پھیلا دیتا ہے، صوفے پر پیر پھیلا کر بیٹھنا ماں کے لیے پریشانی کا سبب ہے نہ کہ حسان کے لیے، چنانچہ ماں نے اپنے احساس کو بیان کرنے والی تعبیر کے ذریعہ اس سے گفتگو کرنے کا ارادہ کیا، ماں نے کہا: ''حسان! جب تم جوتے پہنے ہوئے پیر صوفے پر پھیلا کر بیٹھتے ہو تو مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ نیا صوفہ گندا نہ ہو جائے، میں نہیں چاہتی کہ تم اس کو گندا کرو''، اس پر اس گفتگو کا کوئی اثر نہیں پڑا، اس نے لاپروائی سے جواب دیا: ''میں تو یوں ہی بیٹھنا پسند کرتا ہوں، مجھے اسی طرح اکرام ملتا ہے''، یہ کہتے ہوئے وہ پھر اپنی میگزین پڑھنے میں لگ گیا، ماں نے پھر کہا ''حسان! یا تو صوفے پر مناسب انداز میں بیٹھو یا پھر تم جس طرح بیٹھنا چاہتے ہو ویسے بیٹھو مگر صوفے پر نہیں زمین پر، بتاؤ دونوں آپشن ہیں تم کیا پسند کرو گے؟''، اب اسے ذرا دیر نہیں لگی، اس نے اپنے پیر زمین پر رکھے اور صوفہ پر ہی ٹھیک سے بیٹھ کر پڑھنے لگا۔

آپ نے دیکھا کہ ماں نے اس کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے احساسات کے اظہار کا طریقہ اختیار کیا، لیکن جب مسئلہ حل نہیں ہوا تو اس نے انتخاب (Option) کی آزادی دے دی، وہ نہ ہی جذباتی ہوئی، نہ چیخ و پکار مچائی اور نہ ہی جذبات بے قابو ہوئے، بس اس نے تادیب یعنی اس کو بیٹھنے کا ادب سکھانے کے لیے مناسب اور مؤثر طریقہ استعمال کیا۔

نتائج سے سبق سیکھنا:

اکثر و بیشتر والدین کو دیکھا گیا ہے کہ وہ تادیب کے لیے سزا یا معاوضہ و انعام کا طریقہ اختیار کرتے ہیں، یہی ان کے نزدیک تادیب کے لیے طبعی صورت ہوتی ہے، حالانکہ یہ دونوں ہی عمل نہ ہی دیر تک اثر انداز ہوتے ہیں اور نہ ہی بہت زیادہ مؤثر، اگر ہم چاہتے ہیں کہ بچے ذمہ دار بنیں تو پھر بچوں کے لیے لازمی ہے کہ وہ کاموں کی ذمہ داری اٹھانا سیکھیں، نہ کہ ہر وقت سزا یا انعام کے پیش نظر وہ والدین کی طرف دیکھتے رہیں، بچوں پر اگر کسی کام کو انجام دینے کے لیے زبردستی کی جائے گی تو وہ موقع ملتے ہی اس کام سے بھاگ کھڑے ہوں گے، اس کے برخلاف اگر اسی

کام کو کرنے کے لیے ان کو کچھ اختیار دیا جائے گا تو یہ اختیار ان کے ذمہ داری اٹھانے کا زیادہ طاقتور سبب بنے گا، کیونکہ اس صورت میں ان کے افعال و انتخاب کا انجام ان کے سامنے ہوگا، چنانچہ مثلاً بچے نے یہ طے کرلیا کہ وہ کھانا نہیں کھائے گا، تو اب اس کے اپنے ارادے اور انتخاب کے سبب اس پر لازم ہوگیا کہ بھوک لگنے کے باوجود کھانے کے اگلے وقت کا انتظار کرے، اگر اس نے سویٹر یا جیکٹ پہننے سے انکار کردیا تو ظاہر ہے کہ پھر اس کو ٹھنڈک لگے گی اور اپنے انکار کی وجہ سے سیکھے گا اور اس کو ایک نیا تجربہ حاصل ہوگا، ان دونوں مثالوں میں بھوک اور ٹھنڈک بچے کے اختیار کا لازمی نتیجہ ہیں۔

بچے کو اختیار دینا:

تربیت و تادیب کا راز یہ ہے کہ بچے کو اختیار و انتخاب کا موقع دیا جائے، البتہ اگر کوئی سنگین معاملہ درپیش ہو تو پھر اختیار کی گنجائش نہیں ہوگی، چنانچہ اگر بچہ بدسلوکی اور بداخلاقی کا مظاہرہ کرے تو اس کے ساتھ تکرار نہ کی جائے، فوراً اس کو لکچر نہ دیا جائے، بلکہ اس کو اس طرح اختیار دیا جائے ''دیکھو بچوں میں اس طرح کا شور شرابہ نہیں برداشت کرسکتا، اس لیے یا تو شور کم کرو یا پھر باہر نکل کر کھیلو، دونوں میں سے جو آپشن چاہو اختیار کرو''، اگر پھر بھی شور کم نہ ہو تو سمجھ لیجئے کہ انھوں نے دوسرا آپشن اختیار کیا ہے، اس لیے آپ انھیں پھر اختیار کا موقع دیجئے، ''بچوں مجھے لگتا ہے تم نے باہر نکل کر کھیلنے کا آپشن اختیار کیا ہے، اب بتاؤ تم لوگ خود باہر جاؤ گے یا میں تم کو باہر کروں''، اغلب یہی ہے کہ بچے اپنی عزت نفس کے پیش نظر خود ہی باہر نکل جائیں گے، البتہ اگر وہ جواب نہ دیں تو پھر یہ ممکن ہے کہ بڑی نرمی سے ان کو ہاتھ پکڑ کر باہر کردیا جائے اور یہ تاکید کردی جائے ''کہ دوبارہ تب اندر آئیے گا جب پرسکون طریقہ سے رہنا ہو''، اس طرح بچے کا احترام بھی باقی رہے گا اور اختیار دینے کے اصول پر بھی عمل ہوجائے گا، مزید یہ کہ وہ بہت کم وقت میں اپنے اختیار کے نتائج کا سامنا کرنا بھی سیکھ لے گا۔

ایک اور مثال دیکھیے، تحسین جو بارہ سال کا ہے، صبح دیر تک بستر نہیں چھوڑتا حتی کہ اس کی وجہ سے سبھی اپنے اسکول/ اپنے کام/ اپنے دفتر جانے میں لیٹ ہوجاتے ہیں، والد کے لیے اس مشکل کو اس طرح حل کرنا ممکن ہے کہ وہ تمام افراد خانہ کے ساتھ مل کر صبح گھر سے نکلنے کا وقت متعین کریں اور سب کو مطلع کردیں کہ صبح اس متعین وقت بھر سب کو گھر سے نکلنا ہے، اب جو تاخیر کرے گا اس کو پیدل اسکول جانا پڑے گا، اب اگر تحسین تاخیر کرے گا تو اسے اس کا نتیجہ بھی برداشت کرنا ہوگا، اسکول میں تاخیر سے پہنچنے کے نتیجہ میں جو معاملہ ہوگا وہ اس کو ہی برداشت کرنا ہوگا، عام طور پر اس طرح کے معاملات میں والدین کو پختہ قوت ارادی کا مظاہرہ کرنا چاہیے، الا یہ کہ کوئی اضطراری معاملہ ہو تو کچھ رعایت و مروّت بھی کی جاسکتی ہے۔

بغیر سزا کے نتائج:

جب والدین بچے کی اس طرح تربیت کرتے ہیں کہ اس کو اس کے اختیار کے نتائج کا سامنا کرنے کا موقع دیں، تو بیشتر یہی ہوتا ہے کہ یہ نتائج منطقی اور فطری ہوں، مثلاً عاصم کی گیند سے کھیل کے دوران کمرے کا شیشہ ٹوٹ

جائے، تو نتیجہ کے طور پر اس کو شیشے کی قیمت ادا کرنا پڑے گا، لیکن اگر عاصم کو پہلے ہی اس کا کمرہ غیر مرتب ہونے کے سبب جیب خرچ سے محروم کر دیا گیا ہے تو پھر اس کے کمرے پر توجہ نہ دینے اور جیب خرچ سے محروم کیے جانے کے درمیان فطری ربط نہیں ہوگا، یہاں والد اس سے یہ کہہ سکتے ہیں بجائے اس کے کہ وہ اسے جیب خرچ سے محروم کریں: ''میں نے Vacuum Cleaner سے گھر کی صفائی کر دی ہے، لیکن تمہارے کمرے کے فرش پر سامان بہت بکھرا ہوا تھا اس لیے اس کو چھوڑ دیا ہے، مشین وہیں رکھی ہے تم خود جا کر صفائی کر لو''، اب یہاں چونکہ بچے نے کمرے کو غیر مرتب چھوڑ رکھا تھا تو لازمی طور پر اس کو یہ نتیجہ بھی برداشت کرنا پڑے گا۔

سعید نے اپنے والدین کے ساتھ یہ طے کیا کہ وہ ۹/ بجے سو جائے گا، لیکن پھر اس نے گذشتہ شب اس معاہدہ پر عمل نہیں کیا، اب اس کے والد اس سے یوں کہتے ہیں: ''چونکہ تم نے معاہدہ پر عمل نہیں کیا اس لیے اب دو رات تم کو پہلے کی طرح جلدی سونا پڑے گا یعنی ۸/ بجے تم سو جاؤ،'' دو رات کے بعد ہم از سر نو کوئی معاہدہ کریں گے،'' یہاں محسوس کیا جا سکتا ہے کہ والد کی طرف سے کوئی سزا نہیں دی جا رہی ہے کیونکہ والد نے اس کا اظہار کر دیا کہ دو دن کے بعد از سر نو اتفاق رائے سے پھر کوئی بات طے کر لی جائے گی۔

والدین اگر اس طرح کی گفتگو کریں تو بھی کوئی حرج نہ ہوگا، مثلاً: ''یہ بھی ممکن ہے کہ کل تم نئے سرے سے کوشش کرو''، اس طرح اس کو ایک نئی شروعات کی امید ملے گی، اس کو اس احساس سے بھی بچایا جا سکے گا کہ اس کی کوئی قدر نہیں ہے، اس طرح والدین اور بچوں کے درمیان آپسی محبت و تعلق بھی استوار رہے گا۔

اور بھی بہت سے طریقے ہیں جن کے ذریعہ نتائج کے سزا میں تبدیل ہونے سے بچا جا سکتا ہے، مثلاً والد کو غصہ کی حالت میں کبھی بچے سے یہ نہیں کہنا چاہیے: ''مستقبل میں یہ تمہارے لیے سبق ہوگا''، بلکہ والد کو اس وقت اعصاب پر قابو رکھتے ہوئے اور دور اندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے نرمی کا اظہار کرنا چاہیے، وہ اس نرمی کا اظہار محض اپنے اس جملہ سے کر سکتے ہیں،'' چلو اس وقت ہم لوگ کمرے کی صفائی کر لیں''، اہل خانہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اصل مقصد بچے کو اپنے رویے اور اپنے برتاؤ کے نتائج کو برداشت کرنے کا عادی بنانا ہے، نہ کہ والدین صرف اپنی خواہشات کو زبردستی ان پر نافذ کریں، یہ مقصد باہمی معاہدوں کے ذریعہ اور ذمہ داریوں سے متعلق خود فیصلہ لینے کا موقع دینے سے حاصل کیا جا سکتا ہے، اس طریقہ کا یہ بھی لازمی فائدہ ہے کہ بچے ابتدا سے ہی فیصلہ لینا سیکھتے ہیں، جیسا کہ مثالوں میں دیکھا گیا سونے کے وقت کی تعیین کا فیصلہ، گھر کی صفائی ستھرائی سے متعلق ذمہ داری اور کھانے کے اوقات سے متعلق اختیار و انتخاب وغیرہ میں باہمی گفتگو وغیرہ، بچے کو اختیار دینے سے نہ صرف اس نے کسی آپشن کو اختیار کیا بلکہ پھر اس کے نتائج کا بھی سامنا کیا۔

☆☆☆

❑ مطالعات

علم کلام میں غور وخوض کی ضرورت

(امام ابوالحسن اشعری کا رسالہ ''استحسان الخوض فی علم الکلام'' کا خلاصہ)

مفتی امانت علی قاسمی
استاذ ومفتی دارالعلوم ف دیوبند 07207326738

یہ رسالہ ''استحسان الخوض فی علم الکلام'' امام ابو الحسن علی بن اسمعیل اشعری (۲۶۰-۳۲۴ھ) کا ہے جس میں انہوں نے اہل سنت والجماعت کے عقائد کو عقلی ونقلی دلائل سے ثابت کیا ہے، اس رسالہ میں انہوں نے اللہ تعالی کے وجود، عالم کے حدوث اور بعث بعد الموت کا انکار کرنے والوں کو جواب دیا ہے، اور ان مسائل کو عقلی ونقلی دلائل سے ثابت کیا ہے۔

شیخ ابوالحسن اشعری نے پہلے ابوعلی جبائی معتزلی کی شاگردی اختیار کی یہاں تک کہ معتزلہ کے امام ہوگئے، پھر انہوں نے اعتزال سے توبہ کی اور بصرہ کی جامع مسجد کے منبر پر کھڑے ہوکر انہوں نے اعلان کیا کہ میں خلق قرآن کا قائل تھا، میرا عقیدہ تھا کہ انسانی نگاہیں اللہ تعالی کو نہیں دیکھ سکتی ہیں اور بندہ افعال شر کا خود خالق ہے لیکن میں ان مسائل سے توبہ کرتا ہوں اور معتزلہ سے برأت کا اظہار کرتا ہوں۔ اس رسالہ کے شروع میں محمد الولی الاشعری نے ایک تفصیلی مقدمہ لکھا ہے جس میں انہوں نے امام اشعری کے حالات ان کے مذہب اور ان کی کتابوں کا تعارف کرایا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ علامہ سبکی نے طبقات میں لکھا ہے کہ اشعری نے کسی مذہب کی بنیاد نہیں رکھی ہے؛ بلکہ انہوں نے سلف کا مذہب جس پر صحابہ کرام تھے کو ثابت کیا ہے۔ ابن عبدالسلام شیخ الشافعیہ اور مختلف حضرات کا قول نقل کیا ہے کہ مالکیہ، شافعیہ، حنفیہ اور فضلاء حنابلہ یہ سب اشعری ہیں، امام ابوالقاسم کا قول ہے کہ ابوالحسن اشعری اصحاب الحدیث کے امام ہیں۔ بعض لوگوں نے امام ابوالحسن اشعری پر جو الزمات لگائے ہیں علامہ قرطبی نے '' زجر المفتری علی ابی الحسن الاشعری '' میں اس کا جواب دیا ہے، ابوالحسن اشعری کی تصنیفات کی تعداد پچاس کے قریب بتائی جاتی ہے۔

امام ابوالحسن اشعری کا یہ رسالہ صرف ۱۵ صفحات پر مشتمل ہے جس میں انہوں نے اپنے زمانے کے بعض لوگوں کے رجحان کا جواب دیا ہے، بعض لوگوں خیال تھا کہ علم کلام میں غور وخوض کرنا اور اس کے مسائل میں کھود وکرید کرنا درست نہیں ہے اور حرکت وسکون، جسم وعرض الوان واکوان اور صفات باری میں گفتگو کرنا یہ انسان کو گمراہی کی طرف لے جاتا ہے، ان لوگوں کا خیال یہ تھا کہ اگر ان چیزوں میں گفتگو کرنا ہدایت کی بات ہوتی تو حضور ﷺ اس میں گفتگو کرتے اور آپ ﷺ اور حضرات صحابہ کا گفتگو نہ کرنا دو وجہ سے ہوسکتا ہے یا تو آپ ﷺ کو اور صحابہ کو ان مسائل کا علم تھا اور آپ خاموش رہے، یا آپ ﷺ کو ان مسائل کا علم نہیں

تھا۔ اگر آپ کو علم تھا پھر آپ ﷺ خاموش رہے، تو ہمارے لیے بھی ان مسائل میں خاموش رہنے اور ان مسائل میں غور و خوض ترک کرنے کی گنجائش ہو جاتی ہے جیسا کہ ان حضرات کے لیے ترک خوض کی گنجائش تھی کیوں کہ اگر یہ دین کا کوئی لازمی حصہ ہوتا تو آپ کے لیے خاموش رہنے کی گنجائش نہ ہوتی۔ اور اگر آپ ﷺ کو اور صحابہ کو اس کا علم نہیں تھا تو ہمارے لیے بھی اس کی جہالت کی گنجائش ہوگئی جیسا کہ ان حضرات کے لیے گنجائش تھی اس لیے کہ اگر اس کا علم ضروری ہوتا تو آپ ﷺ اس سے ناواقف نہ رہتے لہٰذا دونوں اعتبار سے علم کلام میں کلام کرنا بدعت اور گمراہی ہے۔

شیخ ابوالحسن اشعری نے اس خیال اور اعتراض کا تین طرح جواب دیا ہے جو اس رسالہ کا اصل مقصد ہے اور یہ رسالہ اسی سوال کے جواب پر محیط ہے، شیخ ابوالحسن اشعری کہتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے جہالت کو ہی اپنا رأس المال بنالیا ہے اور دین میں غور و خوض کرنا ان پر گراں گزرتا ہے یہ لوگ تقلید کی طرف مائل ہیں اور اصول دین میں تحقیق و تفتیش کو گمراہی قرار دیتے ہیں۔

شیخ ابوالحسن اشعری نے ان حضرات کو پہلا جواب الزامی دیا ہے کہ ٹھیک ہے کہ آپ ﷺ نے علم کلام کے ان موضوعات پر کلام نہیں کیا ہے لیکن آپ ﷺ نے ان موضوعات پر کلام کرنے کو بدعتی اور گمراہ کہنے کے لیے بھی نہیں کہا ہے پس ایسے لوگ خود گمراہ اور بدعتی ہیں اس لیے کہ یہ لوگ ان کو گمراہ کہہ رہے ہیں جن کو حضور نے گمراہ نہیں کہا ہے۔

شیخ ابوالحسن اشعری دوسرا جواب یہ دیتے ہیں کہ علم کلام کے موضوعات جیسے حرکت و سکون، جسم و عرض، جز وغیرہ، آپ ﷺ ان مسائل سے واقف تھے اگر چہ کہ متعین طور پر آپ نے کلام نہیں کیا ہے لیکن یہ وہ چیزیں ہیں جن کی اصل قرآن وسنت میں اجمالی طور پر موجود ہے، مثلاً حرکت و سکون کی اصل قرآن میں موجود ہے اور اس سے توحید پر استدلال ہوتا ہے جیسے کہ حضرت خلیل علیہ السلام کی گفتگو میں اللہ تعالی نے سورج، چاند ستارے کے ڈوبنے کی گفتگو کو نقل کیا ہے اور یہ استدلال کیا ہے کہ یہ چیزیں ایک جگہ سے دوسری جگہ سے منتقل ہوتی ہیں اور حرکت کرتی ہیں اور یہ چیزیں اللہ تعالی میں ممکن نہیں ہیں اور جن میں یہ چیزیں ہوں وہ خدا نہیں ہے، حضرت ابراہیم نے بھی اللہ تعالی کے وجود پر اسی سے استدلال کیا تھا۔

اسی طرح اصول توحید پر گفتگو بھی کتاب اللہ میں موجود ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے **لو کان فیھما آلھة الا اللہ لفسدتا** یہ جملہ بہت مختصر ہے لیکن اللہ تعالی کی وحدانیت کی دلیل ہے۔ متکلمین نے توحید کے سلسلے میں جو کچھ بھی کلام کیا ہے اس کی بنیاد یہی آیت ہے، اسی طرح علم کلام کا ایک مسئلہ بعث بعد الموت کا ہے، جس میں عقلاء عرب حیران تھے اور اس کے امکان پر تعجب کرتے تھے اور کہتے تھے **أاذا متنا و کنا ترابا ذلک رجع بعید** (کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جاؤں گا تو ہم پھر لوٹائے جائیں گے یہ لوٹایا جانا بڑی دور کی بات ہے) **من یحی العظام و ھی رمیم** (ہڈیوں کے بوسیدہ ہو جانے کے بعد کون ان ہڈیوں میں جان ڈالے گا) شیخ اشعری کہتے ہیں کہ بعث بعد الموت کا انکار کرنے والے دو طرح کے لوگ تھے ایک تو وہ لوگ تھے جو پہلی تخلیق کو تو مانتے تھے اور اس کا اقرار کرتے تھے لیکن دوبارہ پیدا کئے جانے کا انکار کرتے تھے۔ دوسرا گروہ وہ تھا جو دونوں

تخلیق کا انکار کرتا تھا اور عالم کے قدیم ہونے کا قائل تھا۔ اللہ تعالی نے دونوں گروہ کو جواب دیا ہے: پہلے گروہ کو جواب دیتے ہوئے فرمایا **قل یحییھا الذی انشأ اول مرة** (آپ کہہ دیجئے وہ ذات دوبارہ زندہ کرے گی جس نے پہلی مرتبہ زندہ کیا ہے) **ھو الذی یبدأ الخلق ثم یعیدہ و ھو اھون علیہ** (وہ ذات جس نے تخلیق کی ابتداء کی ہے وہ دوبارہ زندہ کرے گا اور وہ اس پر آسان ہے) یعنی جس نے پہلی مرتبہ بلا کسی مثال اور نمونے کے پیدا کیا اس کے لیے دوبارہ پیدا کرنا اور بھی آسان ہے۔

دوسرا گروہ جس نے دونوں تخلیق کا انکار کیا ہے اور عالم کو قدیم کہا ہے ان لوگوں کو ایک شبہ ہوا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم حیاۃ (زندگی) کو تازہ اور گرم دیکھتے ہیں (یعنی زندگی میں حرارت اور تازگی ہے) اور موت کو ٹھنڈا اور خشک مٹی کی طبیعت کی طرح۔ (یعنی موت میں برودت اور خشکی ہے) پس یہ کیسے ممکن ہے کہ زندگی اور موت یعنی مٹی کے درمیان اجتماع ہو اس لیے کہ حیات اور مٹی یہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ شیخ ابوالحسن کہتے ہیں کہ دو ضد کا ایک محل میں تو اجتماع محال ہے لیکن دو محل میں اجتماع ممکن ہے خود قرآن میں اس کی مثال موجود ہے اللہ تعالی کا ارشاد ہے **الذی جعل لکم من الشجر الاخضر نا را فإذاانتم منہ تو قدون** اس آیت میں غور کیجئے درخت جو ٹھنڈی اور تر ہے اس سے آگ کا خروج ہو رہا ہے جو خشک اور گرم ہے۔ یہاں پر آگ اور درخت کا اجتماع ہو رہا ہے لیکن یہ دو محل میں ہے اسی طرح موت وحیات کا اجتماع دو محل میں ممکن ہے۔

شیخ ابوالحسن اشعری نے اس خیال کا تیسرا جواب یہ دیا کہ ان کا مسائل کا تفصیلی علم آپ کو تھا لیکن یہ مسائل آپ کے زمانے میں پیش نہیں آئے تھے اس لیے آپ ﷺ نے اس پر کلام نہیں کیا حالاں کہ اس کے اصول قرآن وسنت میں موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مسائل صحابہ کے زمانے میں پیش آئے تو صحابہ کرام نے ان پر کلام کیا ہے بلکہ مناظرہ بھی کیا ہے جیسے علم فرائض میں عول کا مسئلہ اور جدات کا مسئلہ اسی طرح حدود اور طلاق کی بعض صورتیں جس پر آپ ﷺ نے کوئی صراحت نہیں کی لیکن حضرات صحابہ نے قرآن وسنت کی روشنی میں اس پر کلام کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں ان مسائل میں اختلاف بھی ہوا ہے، اگر نص کی صراحت ہوتی تو اختلاف نہ ہوتا لیکن حضرات صحابہ نے ان مسائل کا اپنے فہم اور اجتہاد سے قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دیا۔ اگر یہ مسائل حضور کے زمانہ میں پیش آتے تو آپ ﷺ بھی اس کا جواب دیتے جیسا کہ آپ کے صحابہ نے جواب دیا ہے یعنی آپ کا جواب نہ دینا اس لیے تھا کہ یہ مسائل اس وقت پیدا نہیں ہوئے تھے۔ (حضرات صحابہ کے عمل سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی مسئلہ ایسا آئے جس کے سلسلے میں نص میں کوئی صراحت نہ ہو تو اجتہاد کے ذریعہ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دینا چاہیے)

ان تین جوابات کے بعد امام ابوالحسن اشعری نے غور وخوض کی ضرورت پر کلام کرتے ہوئے ان لوگوں سے سوال کیا ہے جو کلام میں غور وخوض کو ناپسند کرتے ہیں کہ آپ ﷺ سے قرآن کا مخلوق یا غیر مخلوق ہونا ثابت نہیں ہے پھر آپ لوگ قرآن کو غیر مخلوق کیوں کہتے ہیں؟ شیخ ابوالحسن کہتے ہیں کہ اگر وہ حضرات یہ جواب دیں کہ بعض صحابہ اور تابعین قرآن کے غیر مخلوق ہونے کے قائل تھے اس لیے ہم قرآن کو غیر مخلوق کہتے ہیں تو یہی کہا جائے گا کہ ان کو بھی وہی لازم آتا

جو آپ حضرات کو لازم آتا ہے کہ وہ گمراہ ہیں اس لیے کہ انہوں نے وہ کہا جو حضور ﷺ نے نہیں کہا ہے۔ اور اگر کوئی یہ کہے کہ اس سلسلے میں توقف کروں گا نہ قرآن کو مخلوق کہوں گا نہ غیر مخلوق کہوں گا تو ان سے کہا جائے گا کہ آپ اس توقف میں گمراہ ہیں اس لیے کہ آپ ﷺ نے یہ نہیں کہا تھا کہ اگر میرے بعد یہ واقعہ پیش آئے تو توقف کرنا اور کچھ نہ بولنا اور نہ ہی آپ نے یہ کہا تھا کہ جو قرآن کو مخلوق یا غیر مخلوق کہے اس کی تضلیل و تکفیر کرنا۔

شیخ ابوالحسن نے ایک دوسرا سوال کیا ہے کہ یہ بتایئے کہ اگر کوئی کہنے والا یہ کہے کہ اللہ تعالی کا علم مخلوق ہے تو آپ توقف کریں گے؟ اگر اس کے جواب میں وہ حضرات یہ کہیں کہ نہیں! ان سے کہا جائے گا کہ آپ ﷺ اور حضرات صحابہ سے تو اس سلسلے میں کچھ منقول نہیں ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اللہ شکم سیر ہے، یا بھوکا ہے، یا کپڑا پہنا ہوا ہے یا بغیر کپڑے کے ہے یا اللہ کے جسم ہے وغیرہ تو آپ کے اپنے اصول کے مطابق آپ کو خاموش رہنا چاہیے اس لیے کہ آپ ﷺ نے ان مسائل پر کوئی کلام نہیں کیا ہے اور نہ ہی آپ کے صحابہ نے کلام کیا ہے یا آپ خاموش نہیں رہیں گے اور بیان کریں گے کہ اللہ تعالی کے لیے یہ چیزیں درست نہیں ہیں ان ان دلائل سے۔

اگر کوئی کہنے والا کہے کہ میں اس وقت خاموش رہوں گا اور کوئی جواب نہیں دوں گا اور نہ ہی ایسے کہنے والے کو سلام کروں گا اور نہ ہی اس کی عیادت کروں گا اور جب وہ مرے گا تو اس کے جنازہ میں حاضری نہیں دوں گا تو ہم ان سے کہیں گے کہ آپ ان باتوں میں گمراہ اور مبتدع ہیں اس لیے کہ حضور ﷺ نے یہ نہیں کہا کہ جو ان مسائل کے بارے میں پوچھے تو خاموش رہو اور نہ ہی آپ نے یہ کہا کہ ان کو سلام مت کرو اس لیے آپ ایسا کرنے میں مبتدع ہیں پھر آپ اپنے فلسفہ کے مطابق ان لوگوں کے حق میں خاموش کیوں نہیں رہے جنھوں نے قرآن کو مخلوق کہا اور کیوں آپ نے ان کی تکفیر کی حالاں کہ قرآن کے مخلوق ہونے اور قرآن کو مخلوق کہنے والے کی تکفیر کے سلسلے میں کوئی حدیث نہیں ہے۔ اگر یہ لوگ اس کا یہ جواب دیں کہ امام احمد بن حنبل قرآن کو غیر مخلوق کہتے تھے اور مخلوق کہنے والے کی تکفیر کرتے تھے اس لیے ہم بھی قرآن کو غیر مخلوق کہتے ہیں اور مخلوق کہنے والے کی تکفیر کرتے ہیں تو ان سے پوچھا جائے کہ آخر امام احمد بن حنبل نے توقف کیوں نہیں کیا اور انہوں نے اس سلسلے میں کلام کیوں کیا؟

ایک آخری سوال شیخ ابوالحسن اشعری نے یہ کیا ہے کہ آپ ﷺ نے نذر، وصیت اور عتق کے سلسلے میں اور علم فرائض میں مناسخہ کے سلسلے میں کلام نہیں کیا ہے اور نہ کوئی کتاب تصنیف کی ہے جیسا کہ امام مالک، سفیان ثوری امام ابوحنیفہ نے ان موضوعات پر کتاب تصنیف کی ہے پس تمہارے اصول کے مطابق تو لازم آتا ہے کہ یہ حضرات بھی مبتدع اور گمراہ ہوں کیوں کہ ان حضرات نے وہ کیا ہے جو حضور ﷺ نے نہیں کیا ہے۔ لیکن آپ ایسا نہیں کرتے ہیں۔ عاقل کے لیے اشارہ کافی ہے۔

شیخ ابو الحسن نے بڑے ہی دلچسپ اور منطقی انداز میں ان لوگوں کو جواب دیا جو علم کلام میں غور وخوض کو ناپسند کرتے تھے اور علم کلام میں غور وخوض کی ضرورت پر مدلل گفتگو کی ہے۔

☆☆☆

❑ مطالعات

داراشکوہ اوراس کی تصانیف کی عصری معنویت

ڈاکٹر محمد حبیب

حالات زندگی:

اجمیر میں مشہور بزرگ سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا مقبرہ ہے ۔ سالہاسال سے وہاں بلاتفریق دین و مذہب عوام کا ہجوم رہتا ہے۔شہزادہ خرم (شاہجہاں) بھی انکے مقبرے پر اکثر جایا کرتے تھے کیونکہ انکے یہاں صرف بیٹیاں ہی پیدا ہورہی تھیں۔چنانچہ ۳۰ مارچ ۱۶۱۵ءکو بروز پیر بیٹا پیدا ہواتو اس کے والدین بہت خوش ہوئے،اس کے دادا جہانگیر نے اس کا نام داراشکوہ رکھا۔

داراشکوہ کی ابتدائی زندگی کے حالات بہت کم ملتے ہیں کیونکہ مغل دور کے مورخین نے اپنی زیادہ تر توجہ ملک میں سیاسی واقعات بیان کرنے تک ہی محدود رکھی ہے۔اس نے مختلف علوم وفنون سیکھنے کے لیے مختلف اساتذہ سے استفادہ کیا جن میں مولوی کے ساتھ ساتھ یوگی اور پنڈت بھی شامل ہیں۔

۱۶۳۲ءمیں اس کی شادی کریم النساء نامی خاتون سے ہوئی جو عام طور پر نادرہ بیگم کے نام سے جانی جاتی ہیں۔داراشکوہ کے سرکاری کیریئر کا آغاز ۱۶۳۳ءمیں ہواجب شاہجہاں کی سالگرہ کے موقع پر اسے ''شاہ اقبال بلند'' کا خطاب ملا،نیز اسے بارہ ہزارذات اور چھ ہزار سوار کا منصب عطاء ہوا۔بعد میں وہ الہ آباد، پنجاب، گجرات، ملتان اور بہار کا گورنر بھی بنا جس کے نظم ونسق کواس کے نائبین دیکھتے تھے کیونکہ وہ خود شاہی دربار سے جڑا ہوا تھا۔

شاہجہاں اخیرعمر میں سخت بیمار پڑا جس کی وجہ سے بھائیوں کے درمیان تخت شاہی کے لیے رسہ کشی شروع ہوگئی اور جنگ شروع ہوگئی جس میں شہزادہ اورنگزیب کواس کی خداداد جنگی صلاحیتوں کی بنا پر کامیابی ملی اور داراشکوہ اپنے نظریات کی وجہ سے مرتد قرار پایا اور علماء کی طرف سے موت کی سزا سنائی گئی۔۳۰ اگست ۱۶۵۹ءکو بدھ کی رات اسے موت کی سزا دے دی گئی۔اس طرح شاہجہاں کالاڈلا بیٹا اور ہندوستان کا ہونے والا بادشاہ اس دار فانی سے کوچ کرگیا۔ہمایوں کے احاطے میں اسے دفن کیا گیا۔

داراشکوہ ایک عالم اورصوفی بھی تھاجسے اسلام اور ہندو دھرم سے خاصا لگاوتھا۔وہ علم دوست تھااس لیےاس کے پاس ہرمذہب کےعلماء،ادباءاورامراء جمع ہوگئے تھے۔وہ انکی علمی وادبی صلاحیتوں سےخوب استفادہ کرتا اورخوب نوازتا بھی تھا۔تصوف اورصوفیاء سے اس کو خاص لگاوتھا۔مشہورصوفی میاں میرؒ سے جوانی میں اس کے بہت گہرے روابط تھے۔علم تصوف اورتاریخ تصوف پراس نے جوگرانقدرتصانیف چھوڑی ہیں وہ نہایت ہی قیمتی سرمایہ ہیں۔مغل حکمراں خاندان میں داراشکوہ وہ شخص ہے جس نے علمی بنیاد پر اسلام اور ہندو دھرم کو

قریب کرنے باقاعدہ کوشش کی۔''داراشکوہ'' نامی ناول کے مصنف نے داراکومشترکہ تہذیب کا ترجمان قرار دیتے ہوئے ایک جگہ رقم طراز ہیں:

''ساموگڑھ کے سینے میں وہ میزان نصب ہوئی جس کے ایک پلڑے میں روایت تھی اور دوسرے میں دل،ایک طرف سیاست تھی تو دوسری طرف محبت،ایک طرف فلسفۂ حکمت تو دوسری طرف شعروادب،اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک طرف تلوارتھی تو دوسری طرف قلم''(داراشکوہ،ص،۱۴۶)

آگے قاضی صاحب داراکی اورنگزیب کے ساتھ جنگ پرنہایت ہی قیمتی تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ساموگڑھ کی لڑائی شاہجہاں کے دو بیٹوں کے مابین تخت وتاج کے حصول ہی کے لیےنہیں لڑی گئی تھی بلکہ یہ دونظریوں کی جنگ تھی جس کا فیصلہ ساموگڑھ کے صفحۂ تلوار کی نوک سے لکھا گیا۔سیاسی،تہذیبی اور عسکری نقطہ نظر سے یہ جنگ ہندوستان کی اہم ترین جنگوں میں سے ایک تھی۔ساموگڑھ نے یہی نہیں کیا کہ ہندوستان کا تاج دارا سے چھین کر اورنگزیب کے سر پر رکھ دیا بلکہ مغل تاریخ کے زریں باب پر مہر لگادی جسے اکبر کا عہد کہا جاتا ہے''۔(داراشکوہ،ص،۱۹۰)

داراشکوہ کی تصانیف عصر حاضر کے تناظر میں بڑی اہمیت کی حامل قرار دی جاسکتی ہیں جب کہ بین المذہب مکالمے کا کلچر عام ہورہا ہے،امن کے قیام اور مختلف تہذیبوں کے درمیان ہم آہنگی کی راہیں تلاش کی جارہی ہیں۔آگے ہم اس کی تصانیف کا جائزہ لیں گے جس سے اس کی تصنیفات کی قدر قیمت کا اندازہ لگانا آسان ہوگا اور موجودہ دور میں اس کی افادیت کو سمجھنا ممکن ہوگا۔

داراشکوہ کی تصانیف

سفینۃ الاولیاء

یہ داراشکوہ کی پہلی تصنیف ہے۔۲۵ سال کی عمر میں اس کتاب کو لکھا گیا۔

داراشکوہ کے دل میں صوفیوں اور درویشوں کا بڑا احترام تھا۔اسے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ معروف ومشہور صوفیوں کے حالات زندگی کسی ایک کتاب میں نہیں ملتے۔چنانچہ اس نے یہ کتاب لکھی۔اس کتاب کا مقصد تمام مسالک کے صوفیوں کے احوال و فضائل کے علاوہ انکی تواریخ وفات درج کرنا ہے۔تقریبا دوسوصفحات پر مشتمل اس کتاب میں رسول اللہ ﷺ ، ازواج مطہرات ، خلفاء راشدین، اماموں اور صوفیوں سمیت چار سو سے زائد شخصیات کے احوال درج ہیں۔اس تصنیف میں داراشکوہ اپنے آپ کو حنفی قادری لکھتا ہے۔

دارا نے سوانحی خاکوں کو نہایت سادہ زبان میں بیان کیا ہے۔دارااس بات کے لیے تعریف کا مستحق ہے کہ اس نے صوفیاء کے احوال اور انکی تواریخ وفات کو اس وقت اکٹھا کیا جب جدید سہولیات کا وجود بھی نہ تھا۔

اس کتاب کو شہزادہ داراشکوہ نے جوانی میں لکھا تھا لیکن اس کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو روحانی دنیا کا بھی شہزادہ سمجھتا ہے۔چنانچہ لکھتا ہے کہ ایک رات خواب میں دیکھا کہ چار بزرگ سفید لباس میں ایک دوسرے کے پیچھے جارہے ہیں۔کسی سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ جواب ملا کہ پیغمبر ﷺ کے چار دوست (خلفاء راشدین) ہیں۔داراشکوہ بھی انکے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔یہ سب حضرات ایک دریا سے گزر کر ایک بلند پہاڑ پر پہنچے اور برابر کھڑے ہوگئے۔داراشکوہ نے باری باری ان سب کو سلام پیش کیا اور فاتحہ کی درخواست کی۔سب نے سلام کا جواب دیا اور علیحدہ علیحدہ فاتحہ پڑھی۔پھر داراشکوہ کو عنایات خصوصی کے ساتھ رخصت کیا۔داراس خواب کو اپنے نصیب کی بیداری جانتا ہے اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

یہ کتاب پہلی دفعہ ۱۸۵۲ء میں آگرہ میں چھپی۔پھر ۱۸۷۲ء

میں لکھنو سے اور ۱۸۸۴ء میں کانپور سے چھپی۔ اب یہ کتاب صحیح کے بعد تہران سے چھپی ہے۔

سکینۃ الاولیاء

یہ داراشکوہ کی دوسری کتاب ہے۔ یہ کتاب اس نے اس وقت لکھی جب اس کی عمر صرف ۲۸ سال تھی۔ اس کتاب میں زیادہ تر سلسلہ قادریہ کے میاں میرؒ اور انکے مرید، داراشکوہ کے پیر و مرشد ملا شاہ کے سوانح ہیں۔ مزید یہ کہ جہاں ان دونوں صوفیوں سے بے پناہ عقیدت واحترام کا اظہار ہے وہیں میاں میر کے مریدوں کا بھی تھوڑا سا ذکر ہے۔

داراشکوہ نے اس کتاب میں نہ صرف میاں میر اور ملا شاہؒ کے حالات لکھے ہیں بلکہ ان سے اپنے تعلقات کو بھی بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ تصوف کی نظر سے مختلف مسائل پر بحث کی ہے۔ مثلاً، سماع کی خواہش، روحانی معلم کی ضرورت، شیخ کی طلب وغیرہ۔

اس کتاب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہاں دو دفعہ میاں میرؒ سے ملنے گیا۔ پہلی دفعہ اس وقت جب داراشکوہ بہت زیادہ بیمار پڑا اور ڈاکٹر عاجز آ گئے اور صحت یابی کی امیدیں معدوم ہوگئی تھیں، دوسری دفعہ ۸ رجب ۱۰۴۴ھ کو برہنہ پا ان کے کمرے کی طرف گیا اور بہت ہی خوش گوار اور لطیف باتیں ہوئیں۔ دارا کہتا ہے کہ بادشاہ شاہجہاں نے ہمیشہ میاں میرؒ کی تعریف کی اگرچہ وہ صوفیوں اور درویشوں کا بہت زیادہ معتقد نہیں تھا۔

اس کتاب سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ میاں میرؒ سماع سے بھی شغف رکھتے تھے۔ ہندی راگ کو خوب سمجھتے تھے اور اسے بہت پسند کرتے تھے۔ قوالوں سے گانا سنتے لیکن وجد میں آتے نہ رقص کرتے۔ محفل سماع میں کوئی حرکت صادر ہوتی نہ ہاتھ اٹھاتے۔

اس کتاب میں جابجا میاں میرؒ کی کرامات کا تذکرہ ملتا ہے۔ کچھ کرامت ایسی ہیں جو بالکل حقیقت کے خلاف ہیں جیسے مردے کو زندہ کرنا وغیرہ۔

۱۶۴۰ء میں داراشکوہ نے میاں میرؒ کے ایک مرید اور قادری سلسلے کے شیخ ملا شاہ بدخشانیؒ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ داراشکوہ کی ان سے پہلی ملاقات کشمیر میں ہوئی۔ وہیں پر ان سے بیعت ہوا۔ انہوں نے بدرجہ کمال اس کی تربیت کی اور ذکر میں مشغول رکھا۔ ملا شاہؒ دارا سے بہت محبت کرتے تھے۔ جس وقت بھی وہ انکے پاس جاتا یا پھر وہاں سے رخصت ہوتا تو ملا شاہ کھڑے ہو کر اس کی تواضع کرتے۔

رسالہ حق نما

داراشکوہ کی یہ تیسری تصنیف ۳۰ صفحات پر مشتمل ایک رسالہ ہے۔

دارا شکوہ نے یہ رسالہ حقیقت کی تلاش میں سرگرداں اشخاص کے لیے لکھا ہے۔ اس رسالے کے تعارف میں وہ لکھتا ہے کہ بزرگ کامل کے بغیر یہ رسالہ نہیں پڑھنا چاہئے۔ اس میں روحانی ارتقاء کے مختلف مراحل کا خلاصہ دیا ہوا ہے اور روحانی تکمیل کے سب سے بلند درجوں پر پہنچنے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔

داراشکوہ مزید کہتا ہے کہ اس کی پہلی تصنیف ''سفینۃ الاولیاء'' ان دنوں کی یادگار ہے جب وہ مرشد کامل کی تلاش میں تھا۔ اس نے اپنی کتاب ''سکینۃ الاولیاء'' اس وقت لکھی جب اسے مرشد کامل کی صحبت نصیب ہوگئی تھی اور سلوک و مقامات کی راہوں کا علم حاصل ہوگیا تھا، اور اب جب کہ خدا نے اس پر عرفان کے دروازے کھول دیے ہیں تو اس کا اظہار اس رسالے میں کر رہا ہے۔

وحدۃ الوجود کے بارے میں داراشکوہ کا نقطہ نظر وہی ہے جو ابن عربی اور انکے ہم خیال صوفیاء کا ہے۔

حسنات العارفین

حسنات العارفین یا شطحیات دارا شکوہ کی چوتھی کتاب ہے۔ یہ صوفیاء کے ان مجذوبانہ خیالات کا مجموعہ ہے جو اسلام کے مروجہ عقائد کے خلاف معلوم ہوتے ہیں۔ دارا شکوہ خود لکھتا ہے کہ بے خودی کے لمحوں میں حقائق کے انکشافات اعتراضات کا سبب بنے، کیونکہ میں سالکوں کی موجودہ کتابوں سے غیر مطمئن رہا اور کبھی کبھی بے خودی کے عالم میں ایسی باتیں کہ جاتا ہوں جن میں اعلیٰ سچائیاں ہوتی ہیں لیکن بعض کم ظرف لوگ اپنے کھوکھلے علم کی وجہ سے مجھے بدعتی اور مرتد قرار دیتے ہیں۔ اس پر میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ میں ممتاز ہستیوں کے ان اقوال کو جنہیں شطحیات کہا جاتا ہے تحریر میں لاوں تاکہ وہ لوگ بھی قائل ہوسکیں جو حضرت عیسیٰؑ کے بجائے دجال، حضرت موسیٰؑ کے بجائے فرعون اور حضرت محمد ﷺ کے بجائے ابوجہل کا طریقہ اپنائے ہوئے ہیں۔

دارا شکوہ کے اس بیان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ مذہبی معاملات میں کس قدر لبرل اور بے باک ہو چکا تھا جس کی وجہ سے بالآخر راسخ العقیدہ مسلمان اس کے خلاف ہوگئے تھے۔

دارا جگہ جگہ قرآنی آیات کے حوالے دے کر اپنے وحدۃ الوجود کے نظریے کو ثابت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

مثلاً قرآن مجید کی یہ آیت۔

هو الاول و الاخر و الظاهر و الباطن (الحدید: آیت۔۳)

ترجمہ۔ وہی اول، وہی اخر، وہی ظاہر اور وہی باطن ہے۔

دارا کے بقول اس ایت کا مفہوم یہ ہے کہ وجود مجھ میں ہے اور سب کچھ میں ہوں۔ یعنی کسی چیز کا کوئی وجود نہیں، سب کچھ وہی ہے۔۔

اس کتاب کے مطالعے سے دارا شکوہ کی فکر اور اس کے نظریے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مجمع البحرین

دارا شکوہ نے اب تک جو کچھ بھی لکھا تھا وہ مسلم صوفیوں سے متعلق لکھا تھا۔ تحقیق و تصنیف کے دوران اس نے ہندو فکر و فلسفے کا بھی گہرا مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اسلام اور ہندو دھرم میں صرف اصطلاحات کا فرق ہے۔ بنیادی عقائد وہی ہیں۔ اس نے اپنے ان خیالات کا اظہار اپنی پانچویں تصنیف ''مجمع البحرین'' میں کیا ہے۔ اس کتاب میں جابجا ہندو دھرم اور اسلام کی مترادف اصطلاحات بھری ہوئی ہیں۔ یہ تصنیف تقابل ادیان کا ذوق رکھنے والوں کے لیے ایک عمدہ کتاب ہے کیونکہ یہ دو بالکل مختلف مذاہب کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی ایک کوشش ہے۔ اگرچہ اس کتاب کی زبان اور اسلوب بہت اچھا نہیں ہے لیکن اس کے ذریعے دو ادیان کو قریب لانے کی دارا کی کوششوں کو سمجھا جاسکتا ہے۔

اس کتاب کی شروعات مختلف صوفیاء کے ہمہ اوست کے نظریے کی وضاحت کرنے والے اشعار سے ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں وہ اتنا آگے بڑھ گیا کہ لکھتا ہے۔

التصوف هو الانصاف و التصوف ترك التكليف

(تصوف انصاف ہے، نیز تصوف فرائض مذہبی ترک کرنے کا نام ہے۔)

اس کتاب میں دارا نے مسئلہ آفرینش، قیامت اور معرفت ربانی پر بات کی ہے اور اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اس سلسلے میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں صرف زبان و بیان کا اختلاف ہے۔ حالانکہ حقیقت میں دونوں طرف کے اسکالرز اس کی باآسانی تردید کرسکتے ہیں۔ البتہ دارا کی اس کتاب کے ذریعے دونوں مذاہب کو قریب کرنے کی کوشش کا

اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اس کتاب میں دارا نے قیامت اور مکتی کے نظریے کو لیکر دونوں مذاہب کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔اس کے نزدیک مکتی کا مطلب تعینات کا تباہ ہوکر ذات حق میں غائب ہوجانا ہے۔

اس کے بعد دارا لکھتا ہے کہ مکتی کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ ''جیون مکتی'' یا زندگی میں نجات۔ ہندووں کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی ہی میں اللہ کی معرفت حاصل ہوجائے اور انسان سب چیزوں کو ایک دیکھے اور ایک جانے۔

۲۔ ''سب مکتی''، یعنی ''سب سے آزادی'': یہ ذات حق میں مل جانے کا نام ہے۔ دارا کے مطابق قرآن کی مندرجہ ذیل آیات اسی طرف اشارہ کرتی ہیں:

و رضوان من الله اكبر۔ ذالك هو الفوز العظيم۔ (سورۃ التوبہ،آیت ۷۲)

(اور ان سب سے بڑھ کر نعمت یہ ہے کہ ان پر اللہ کی خوشنودیوں کا نزول ہوگا۔)

الا ان اولياء الله لا خوف عليهم ولا هم يحزنون (سورہ یونس،آیت ۶۲)

(یاد رکھو، جو اللہ کے دوست ہیں ان کے لیے نہ تو کسی طرح کا خوف ہوگا نہ غم)

۳۔ ''سربد مکتی''، یعنی عارف بن جانا۔ قرآن میں جہاں جہاں جنت میں ہمیشہ رہنے کے لیے خالدين فيها ابدا آیا ہے اس سے مراد معرفت کی جنت ہے۔

مذکورہ بالا باتیں یقیناً اسلامی تشریحات کے خلاف ہیں لیکن دارا کی ہندووں اور مسلمانوں کو قریب کرنے کی کوششوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مذکورہ بالا تصنیف کے علاوہ دارا شکوہ نے گیتا اور اپنشد کے منتخب حصوں کا ترجمہ بھی کرایا جس کا مقصد اس نے یہ بیان کیا ہے کہ وہ اپنی نسل اور خاندان کو ان کتابوں سے واقف کرانا چاہتا ہے۔

حقیقت میں دیکھا جائے تو دارا شکوہ ایک نئے کلچر اور تہذیب کا پرچم لیکر اٹھا تھا جس کی تصویر کشی قاضی عبدالستار نے اپنے ناول میں کچھ اس طرح سے کی ہے:

''اس مقبرے کی گود میں صرف ایک ایسا شہنشاہ آرام فرما نہیں ہے جس کی اولاد نے ہندوستان کی تاریخ میں ایک سنہری جلد کا اضافہ کیا بلکہ وہ دارا شکوہ بھی سو رہا ہے جو ایک تہذیب، ایک تمدن، ایک کلچر کو زندہ کرنے اٹھا تھا مگر تقدیر الٰہی نے اس کے ہاتھ سے قلم چھین لیا اور تاریخ نے اس کے اوراق پر سیاہی پھیر دی''۔ (داراشکوہ،ص،۱۵)

خلاصہ بحث

مغل دور حکومت میں بادشاہوں اور شہزادوں کی مذہبی رواداری اور ہندو مسلم خلیج کم کرنے کی ہزاروں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن علمی اور نظریاتی طور پر دونوں طبقوں کو قریب کرنے کی جو کوشش دارا شکوہ نے کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔اگرچہ اس معاملے میں وہ اعتدال پر قائم نہ رہ سکا اور جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔دارا شکوہ اس اعتبار سے قابل تعریف ہے شہزادہ ہونے کے باوجود اس نے ایسے زمانے میں دو مذاہب کو قریب کرنے کی کوشش کی جب کوئی اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔آج جب کہ مطالعہ مذاہب نے اکیڈمک شکل اختیار کرلیا ہے، تکثیری سماج میں بقائے باہم کی راہیں تلاش کی جارہی ہیں، دنیا کے مختلف فورم پر قیام امن کے لیے مختلف مذاہب کے نمائندے ڈائیلاگ کررہے ہیں، ایسے حالات میں دارا شکوۃ کی تصانیف اور اس کے خیالات سے استفادہ کرنا بہت مفید ہوگا۔

☆☆☆

❑ نقطۂ نظر

داراشکوہ سنگھیوں کا محبوب کیوں؟

محمد اسامہ فلاحی
ریسرچ اسکالر، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ پنجاب

آر ایس ایس برہمنی قیادت کے تحت چلنے والا ایسا گروہ ہے جس کے نظریات اور حرکتیں نہ صرف اسلام دشمنی کے ارد گرد گھومتی ہیں بلکہ انسانیت کے لیے بھی شدید نقصاندہ ہیں۔انکی پوری کوشش ہے کہ اپنا ذات پات کا نظام دوبارہ قائم کریں جو کبھی صدیوں پہلے قائم تھا ،جس میں برہمنیت کا غلبہ ہو اور باقی دنیا انکے انسانیت مخالف ظالمانہ قوانیں کے ماتحت رہنے پر مجبور ہو جائے۔

تاریخ میں جس نے بھی ذات پات کے برہمنی نظام کو چیلنج کیا اور اس کو نقصان پہنچایا اس سے شدید انتقام لیا گیا۔گوتم بدھ کی تعلیمات کے نتیجے میں برہمنیت کئی صدی تک اپنے خول میں بند رہی لیکن دھیرے دھیرے اس نے بدھ مت مین سیندھ لگا کر اس کا ایسا خاتمہ کیا کہ بھارت سے اس کا وجود ہی مٹ گیا۔آج بدھ مت کے ماننے والے کچھ ضرور موجود ہیں لیکن عملاً وہ برہمنیت کے ماتحت رہنے پر مجبور ہیں۔

بھارت میں اسلام کی آمد کے بعد سے اب تک برہمنی نظام،حکومت و اقتدار حاصل کرنے میں ناکام رہا ہے،جس کی وجہ سے اس کے سب سے بڑے دشمن اسلام اور مسلمان قرار پائے۔اور اب صدیوں کی آرزو اور محنت کے بعد اپنے ذات پات کے شیطانی نظام کے قیام کا خواب دیکھ رہے ہیں اور انکی خواہش ہے کہ مسلمانوں کا شدھی کرن کر دیا جائے۔چونکہ ظلم و جبر کے ذریعے ایسا کرنا ناممکن ہے اس لیے ایسی شخصیات کو مسلمانوں کا آئیڈیل بنا کر پیش کیا جائے جو کہ باطل افکار و نظریات کے علمبردار تھے تاکہ اس کے ذریعے پہلے انہیں گمراہ کیا جائے پھر انکا شدھی کرن کیا جاسکے۔تاریخ میں ایسی ہی ایک شخصیت داراشکوہ کی رہی ہے جو کہ آج کل برہمنوں کی محبوب بنی ہوئی ہے۔آر ایس ایس یونیورسٹیوں میں مختلف پروگراموں کے ذریعہ اور کچھ ملت فروش مسلم لیڈران کے زریعہ مسلم سماج کو داراشکوہ جیسے لوگوں کو اپنا رول ماڈل بنانے کی تلقین کر رہا ہے۔

پچھلے ماہ اکتوبر میں پنجاب میں ایک سیمنار کے مہمان خصوصی ایک سوامی جی تھے جنہوں نے حاضرین کو مشورہ دیا کہ وہ داراشکوہ کو اپنا رول ماڈل بنائیں۔اس وقت یہ بات عجیب سی لگی لیکن جب تاریخ کی ورق گردانی کی تو مقصد سمجھ میں آ گیا۔۵ نومبر کو حکومت کے مرکزی وزیر مختار عباس نقوی کی رہائش گاہ پر ایک میٹنگ ہوتی ہے جس میں مسلم قائدین اور دانشوران کی ایک تعداد بھی شریک ہوتی ہے۔اس میٹنگ میں آر ایس ایس کی طرف سے مسلمانوں کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ داراشکوہ کو اپنا رول

ماڈل بنائیں جس کو سبھی نے سر جھکا کر سنا۔اس واقعے کے بعد مسلمانوں کو اچھے سے سمجھ لینا چاہیے کہ سنگھ پریوار دار شکوہ کو کیوں بڑھا چڑھا کر پیش کر رہا ہے؟ نیز آگے بھی اس کے کردار کو بڑھا چڑھا کر پیش کیے جاتے رہنے کا پورا امکان ہے۔اس کے پیچھے چھپے مقصد کو تا صرف اس سوال سے سمجھ لینا چاہیے کہ حکمراں خاندان کے ایک شہزادے سے سنگھ کو اتنی محبت کیوں ہے جب کہ مسلم حکمرانوں کی کردار کشی اس کا وطیرہ رہا ہے؟

جب ہم دارا شکوہ کی زندگی اور اس کے افکار و عقائد کو دیکھتے ہیں تو یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ سنگھ اس کو رول ماڈل کے طور پر کیوں پیش کر رہا ہے۔

حالات زندگی

دارا شکوہ ۱۶۱۵ء میں پیدا ہوا۔وہ شاہجہاں کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔اس کی ابتدائی زندگی کے حالات بہت کم ملتے ہیں کیونکہ مغل دور کے مورخین نے اپنی زیادہ تر توجہ ملک میں سیاسی واقعات بیان کرنے تک ہی محدود رکھی ہے۔اس نے مختلف علوم و فنون سیکھنے کے لیے مختلف اساتذہ سے استفادہ کیا جن میں مولوی کے ساتھ ساتھ یوگی اور پنڈت بھی شامل ہیں۔ ۱۶۳۲ء میں اس کی شادی کریم النساء نامی خاتون سے ہوئی جو عام طور پر نادرہ بیگم کے نام سے جانی جاتی ہیں۔دارا شکوہ کے سرکاری کیریئر کا آغاز ۱۶۳۳ء میں ہوا جب شاہجہاں کی سالگرہ کے موقع پر اسے ''شاہ اقبال بلند'' کا خطاب ملا، نیز اسے بارہ ہزار ذات اور چھ ہزار سوار کا منصب عطاء ہوا۔بعد میں وہ الہ آباد، پنجاب، گجرات، ملتان اور بہار کا گورنر بھی بنا جس کے نظم ونسق کو اس کے نائبین دیکھتے تھے کیونکہ وہ خود شاہی دربار سے جڑا ہوا تھا۔

شاہجہاں اخیر عمر میں سخت بیمار پڑا جس کی وجہ سے بھائیوں کے درمیان تخت شاہی کے لیے رسہ کشی شروع ہوگئی اور جنگ شروع ہوگئی جس میں شہزادہ اورنگزیب کو اس کی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر کامیابی ملی اور دارا شکوہ اپنے نظریات کی وجہ سے مرتد قرار پایا اور علماء کی طرف سے موت کی سزا سنائی گئی۔۳۰ اگست ۱۶۵۹ء کو بدھ کی رات اسے موت کی سزا دے دی گئی۔اس طرح شاہجہاں کا لاڈلا بیٹا اور ہندوستان کا ہونے والا بادشاہ اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔ہمایوں کے احاطے میں اسے دفن کیا گیا۔

دارا شکوہ حکمراں خاندان کا ایسا فرد ہے جس نے سب سے زیادہ تصانیف چھوڑیں لیکن بدقسمتی سے یہ سب گمراہ کن صوفیانہ موشگافیوں اور ہندوانہ تہذیب کی آئینہ دار ہیں۔

دارا شکوہ نے تصوف اور وحدت ادیان کے تحت پانچ کتابیں لکھی۔سکینۃ الاولیاء، سفینۃ الاولیاء، رسالہ حق نما، حسنات العارفین اور مجمع البحرین۔ابتدائی چار کتابیں تصوف سے متعلق ہیں جن میں تصوف کی گمراہیوں کو اکٹھا کر دیا ہے۔آخری کتاب میں اسلامی عقائد کی من مانی تاویلات اور قرآن کی لفظی اور معنوی تحریفات کر کے ہندو عقائد سے ہم آہنگ کرنے کی ناکام جسارت کی ہے جس کو آپ آگے ملاحظہ کریں گے۔

یہاں پر دارا شکوہ کے تصوف سے متعلق افکار کا جائزہ نہیں لیا جائے گا۔یہاں پر ان چیزوں کا ذکر کیا جائے گا جس کو دارا شکوہ نے ہندومت اور اسلام کے پس منظر میں بیان کیا ہے۔جس سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ سنگھ پریوار دارا کے کردار کو کیوں بڑھا چڑھا کر پیش کر رہا ہے اور اس کے پیچھے اس کے عزائم کیا ہیں۔

داراشکوہ چونکہ تین بیٹیوں کے بعد شاہجہاں کا پہلا بیٹا تھا اس لئے بڑے لاڈ و پیار سے اس کی پرورش ہوئی جس کی وجہ سے اس کے اندر صفات حسنہ کے بجائے صفات رذیلہ پروان چڑھے جس کے بعد جہاں اس کی مذہبی زندگی گمراہ کن افکار و خیالات کا مجموعہ بن گئی وہیں پر اس کی ذاتی زندگی بھی بہت خراب ہوگئی۔

''داراشکوہ سے متعلق تقریبا تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ وہ انتہائی بدقماش، بددین، بداخلاق اور آزاد خیال تھا۔ جو ہمیشہ مذہبی معاملات اور عقائد میں تطبیق دینے والا ''صلح کل'' اور اکبری پالیسیوں کا پیروکار تھا۔'' (ماہنامہ براہین، مقالہ، حیات اورنگزیب کے چند گوشے، سید آصف علی ندوی، اکتوبر ۲۰۱۹ء)

عقائد

پنجاب کے مشہور قادری صوفی میاں میر جن کو وہ اپنا استاد مانتا ہے کے بارے میں اس کا عقیدہ تھا کہ وہ مردوں کو زندہ کردیتے تھے (داراشکوہ اپنی تصانیف کے حوالے سے، طارق محمود، ص، ۵۵)

مولانا ضیاءالدین اصلاحیؒ دارا کے عقائد کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''داراشکوہ نے اخیر میں ہندوؤں کے کیش و آئین کو اختیار کرنا شروع کردیا تھا، وہ برہمنوں جوگیوں اور سنیاسیوں کی صحبت میں رہتا تھا اور اسی گروہ کو عارف، مرشد کامل اور واصل حق خیال کرتا تھا اور انکی کتاب وید کو آسمانی اور خطاب ربانی کہتا تھا۔ قرآن مجید میں بیان کردہ اللہ تعالی کے اسمائے حسنی کو ''پربھو'' نام دیتا تھا اور اسی کو اسم اعظم سمجھتا تھا اور جن قیمتی پتھروں اور ہیرے جواہرات کو وہ پہنتا تھا ان پر ''پربھو'' کندہ کرادیا تھا اور ان سے تبرک حاصل کرتا تھا''۔ (معارف، جون ۲۰۰۳ء۔ مقالہ، دارا شکوہ اور اس کا مخلوط مذہب، ص، ۴۱۵)

داراشکوہ نے اپنشد کا ترجمہ سراکبر کے نام سے کیا ہے۔ اس میں بسم اللہ کی جگہ سری کرشن کی تصویر دی اور دیباچہ میں لکھا کہ اصل قرآن یہی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ اس قوم قدیم (ہندووں) کے درمیان تمام آسمانی کتابوں سے پہلے چار آسمانی کتابیں تھیں، رگ وید، سام وید، یجر وید، اتھر وید۔ اور اس وقت کے سب سے بڑے نبی برہما یعنی آدم صفی اللہ پر یہ تمام احکام نازل ہوئے اور یہ تمام باتیں ان کتابوں سے ظاہر ہیں''۔ (حوالہ سابق)

دارا نے آگے بڑھ کر یہاں تک کہا ہے کہ لوح محفوظ وید ہیں۔

۱۹۰۶ء میں علامہ شبلیؒ کی نظر سے سراکبر کا نسخہ گزرا تو اپنا یہ تاثر ظاہر کیا

''عالمگیر نے داراشکوہ کے مقابلے کا جب قصد کیا تو اس کا یہ سبب ظاہر کیا کہ داراشکوہ بدعقیدہ اور بددین ہے۔ اس لیے اگر وہ ہندوستان کا فرمانروا ہوا تو ملک میں بددینی پھیل جائے گی۔ عام مورخین کا خیال ہے کہ یہ محض ایک فریب تھا، نہ داراشکوہ بے دین تھا اور نہ عالمگیر کی مخالفت کا یہ سبب تھا۔ دلوں کا حال اللہ کو معلوم، لیکن کتاب کے دیباچہ سے صاف ظاہر ہے کہ داراشکوہ بالکل ہندو بن گیا تھا، اور کچھ شبہ نہیں کہ اگر وہ تخت شاہی پر متمکن ہوتا تو اسلامی شعار اور خصوصیات بالکل مٹ جاتے۔'' (مقالات شبلی، ج ۷، ص، ۱۰)

مجمع البحرین کی تالیف کے ایک سال بعد ۱۰۶۶ء میں دارا کے حکم سے جوگ بششٹ کا سنسکرت سے فارسی میں

ترجمہ کیا گیا۔اس کا مقدمہ خود دارا شکوہ نے لکھا جس میں اس کے ترجمہ کرنے کی یہ وجہ بیان کی ہے:

''اس کتاب کا جب ہم نے مطالعہ کیا تو رات کو خواب میں دیکھا کہ دو قبول صورت بزرگ ایک اونچے پر کھڑے ہیں۔ ایک بشسٹ تھے دوسرے سری رام چندر جی ...... میں بے اختیار بشسٹ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بشسٹ نے نہایت مہربانی سے ہاتھ میری پیٹھ پر رکھا اور فرمایا: اے رام چندر! یہ سچا طالب ہے اور سچی طلب میں تیرا بھائی ہے اس سے بغل گیر ہوو۔ رام چندر جی کمال محبت سے مجھ سے ملے۔ اس کے بعد بشسٹ نے رام چندر کے ہاتھ میں مٹھائی دی تا کہ مجھے کھلا دے، میں نے وہ شیرینی کھائی۔ اس خواب کے دیکھنے کے بعد ترجمے کی خواہش ازسرنو زیادہ ہوگئی اور حاضرین میں سے ایک شخص کو اس کام پر مقرر کیا''۔(مقدمہ رقعات عالمگیری، از سید نجیب اشرف ندوی، بحوالہ معارف، دارا شکوہ کے خواب، ڈاکٹر عبد الرب عرفان، فروری ۱۹۸۸ء)

مذکورہ بالا پیرا گراف سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دارا اسلام سے کس قدر دور اور ہندومت سے قریب ہو چکا تھا۔ آخر سنگھی حضرات اس سے محبت کیوں نہ کریں اور مسلمانوں کے سامنے بطور رول ماڈل کیوں نہ پیش کریں!

دارا نے اتنے ہی پر بس نہیں کیا بلکہ باطل ہندو عقائد کو صحیح ثابت کرنے کے لیے قرآنی آیات کو خوب توڑا مروڑا ہے۔ ذیل میں اس کی کچھ مثالیں دی جاتی ہیں۔

دارا جگہ جگہ قرآنی آیات کے حوالے دے کر اپنے ہمہ اوست (Pantheism) کے نظریے کو ثابت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

مثلاً قرآن مجید کی یہ آیت:

هو الاول و الاخر و الظاهر و الباطن

(الحدید: آیت۔۳)

ترجمہ۔ وہی اول، وہی اخر، وہی ظاہر اور وہی باطن ہے۔

دارا کے بقول اس ایت کا مفہوم یہ ہے کہ وجود مجھ میں ہے اور سب کچھ میں ہوں۔ یعنی کسی چیز کا کوئی وجود نہیں، سب کچھ وہی ہے۔۔(حسنات العارفین)

دارا نے قیامت اور مکتی کے نظریے کو لیکر دونوں مذاہب کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ اس کے نزدیک مکتی کا مطلب تعینات کا تباہ ہو کر ذات حق میں غائب ہو جانا ہے۔

اس کے بعد دارا لکھتا ہے کہ مکتی کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ ''جیون مکتی'' یا زندگی میں نجات۔ ہندوؤں کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی ہی میں اللہ کی معرفت حاصل ہو جائے اور انسان سب چیزوں کو ایک دیکھے اور ایک جانے۔

۲۔ ''سب مکتی'' یعنی ''سب سے آزادی'': یہ ذات حق میں مل جانے کا نام ہے۔ دارا کے مطابق قرآن کی مندرجہ ذیل آیات اسی طرف اشارہ کرتی ہیں:

و رضوان من الله اكبر۔ ذالك هو الفوز العظيم۔

(سورۃ التوبہ، آیت ۷۲)

(اور ان سب سے بڑھ کر نعمت یہ ہے کہ ان پر اللہ کی خوشنودیوں کا نزول ہوگا۔)

الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیهم ولا هم یحزنون۔(سورہ یونس، آیت۔۶۲)

(یاد رکھو، جو اللہ کے دوست ہیں ان کے لیے نہ تو کسی

طرح کا خوف ہوگا نہ غم)

۳۔ ''سر بدمکتی''یعنی عارف بن جانا۔قرآن میں جہاں جہاں جنت میں ہمیشہ رہنے کے لیے خالدین فیھا ابدا آیا ہے اس سے مراد معرفت کی جنت ہے۔

مجمع البحرین میں داراشکوہ قیامت اور مکتی کے سلسلے میں دونوں مذاہب میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔چنانچہ ''بیان قیامت''اور'' بیان مکتی'' کے عنوانات کے تحت وہ لکھتا ہے کہ موحدان ہند کے مطابق جنت یا دوزخ میں ایک طویل مدت رہنے کے بعد ''مہا پرلی'' ''قیامت کبری''ہوگی جو قرآن کی اس آیت سے بھی ثابت ہے۔

فاذا جاء ت الطامة الکبری (سورة النازعات)

مذکورہ بالا بحث کے بعد یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ دارا اسلام سے بہت دور جا چکا تھا اور اس کے وجود میں برہمنیت کو اپنی منزل قریب نظر آرہی تھی۔دارا کا عروج اسلام کے زوال کی شکل میں سامنے آتا اور انگریز کی غلامی سے پہلے برہمنیت کی غلامی آجاتی۔

جناب سید صباح الدین عبد الرحمان نے اس کی بڑی اچھی تصویر کشی کی ہے۔

''ایک گروہ کا خیال ہے کہ اگر دارا تخت شاہی پر بیٹھتا تو مسلمانوں کی سلطنت باقی رہتی لیکن دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ داراشکوہ کی تخت نشینی سے مسلمانوں کی حکومت تو باقی رہتی لیکن اسلام ختم ہوگیا ہوتا ۔ اورنگزیب کے بعد مسلمانوں کی سلطنت تو ختم ہوگئی لیکن اسلام باقی رہ گیا''۔(معارف، جون ۲۰۰۳ء)

ڈاکٹر عبد الرب عرفان دارا شکوہ کے خرافاتی خوابوں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دارا کے مبینہ خوابوں کے بالاستیعاب مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ بیک وقت مسلمانوں اور ہندوؤں کا اعتماد حاصل کر کے خلافت اور رام راج کو اپنی نام نہاد وحدانیت کے گمراہ کن تصور میں ڈھال کر تخت و تاج پر بلا شرکت غیرے متصرف ہونے کا خواب دیکھ رہا تھا لیکن مشیت کا فیصلہ کچھ اور تھا۔اس کے نام نہاد تصوف پر عالمگیری تسنن اور تشرع نے ایک ایسی کاری ضرب لگائی کہ اس کے عالم بیداری کے خواب کا شیرازہ بکھر گیا''۔(معارف، اعظم گڑھ۔فروری ۱۹۸۸ء،ص،۱۳۷)

مذکورہ بالا بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ باطل حق کے علمبرداروں کو اسلام سے پھیرنے کی خواہش پر عمل پیرا ہیں۔ چونکہ سرداران مشرکین اس وقت حکومت و اقتدار کے مالک ہیں اور مدعیان حق کمزور بنا دیئے گئے ہیں تو باطل اب انہیں ہر طرح سے حق سے پھیرنے کی کوشش کرے گا۔یہاں سورہ ممتحنہ کی آیت حرف بحرف صادق آتی ہے کہ ''اگر وہ (مشرکین) تم پر غلبہ حاصل کرلیں تو تمہارے دشمن بن جائیں گے اور ہاتھ و زبان سے تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے اور ان(مشرکین) کی یہ خواہش ہوگی کہ تم بھی کافر ہوجاؤ''(سورہ الممتحنہ،آیت ۲)

مسلمانان ہند اور اس کی قیادت کو مشرکین کے عزائم اور مقاصد کے تئیں بیدار مغزی کا ثبوت دیتے ہوئے انکی طرف سے فکری اور نظریاتی حملوں سے واقفیت بہت ضروری ہے کیونکہ مشرکین ہند کی طرف سے مسلمانوں کو انہیں جیسے نام کے حامل افراد اور شخصیات کے ذریعے گمراہ کرنے کی کوشش حکومت کی حمایت کے ساتھ کی جائے گی۔

☆☆☆

❑ نظریۂ جہاد

قسط-۳

جنگ سے متعلق عام موقف

تحریر: محمود شیت خطاب

ترجمہ: محمد سہیل ندوی
(استاذ: مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، علی گڑھ)

مکی دور میں دعوت اسلامی کے خفیہ تین سال:

نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب نبوت سے سرفراز کیا گیا اور کار نبوت آپ کے ذمہ کیا گیا، آپ اپنا مشن سمجھ کر دعوت دین کی اشاعت میں مصروف ہوگئے، لوگوں کو سیدھے راستہ کی طرف بلانا شروع کر دیا، مہیب تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لانے کے لیے آپ نے کسی کی پروانہ کی، لوگوں کے تمام جاہلی و سماجی اختلافات کو ختم کر کے صفوں کو متحد کرنے میں مصروف ہوگئے، قلوب کا تزکیہ کرتے رہے، یہ وہ تین سالہ مکی دور ہے جس میں آپ اور آپؐ کے اصحاب نے خفیہ طریقہ سے تعلیمات اسلام پر عمل کیا، چھپ چھپا کر لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی، ایسے حالات میں آپ کہاں جاتے؟ کس سے کہتے؟ کون آپ کی بات پر کان دھرتا؟ اس وجہ سے آپ نے اس کی ابتدا اپنے معتمد علیہ لوگوں سے کی، عزیز و اقارب سے کی، ان سے اسلام کا تعارف کرایا، دراصل یہاں ایسا عزم و استقلال درکار تھا جسے مصائب و مشکلات کے تھپیڑے آسانی سے متزلزل نہ کر سکیں، حکمت عملی کا تقاضا یہی تھا کہ پس پردہ کام کیا جائے، تاکہ اچانک اہل مکہ کے سامنے ایک نئی چیز نہ آئے، یہ بات بالکل فطری تھی کہ آپ نے سب سے پہلے ان ہی لوگوں کو دعوت دی، جن کے چہروں پر آپ ہدایت الٰہی اور خیر کو قبول کرنے کے اثرات دیکھ چکے تھے، یہی لوگ اسلامی تاریخ میں سابقین اولین کے نقش بن کر ابھرے، سچی بات تو یہ ہے آپ نے توحید کے تعارف کے لیے ہر قسم کا مجاہدہ کیا، پھر آپ کو حکم دیا گیا "فاصدع بما تؤمر و أعرض عن المشركين" اب آپ برملا کہیے، علی الاعلان کہیے، مشرکین کی پروانہ کیجئے، کوہِ صفا پر چڑھ کر اس کا بگل بجا دیجئے، صور پھونک دیجئے سب سے کہیے، کھل کر کہیے، وہ بات جس کے کہنے پر آپ کو مامور کیا گیا ہے اور مشرکین سے اعراض کیجئے۔

علانیہ دعوت:

نبی عربیؐ نے اس حکم الٰہی کے بعد اسلامی تعلیمات کو علی الاعلان قریش کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا، آپؐ نے برملا کہنا شروع کیا کہ اب شرک و بت پرستی چھوڑ دو، سینکڑوں ہزاروں معبودان باطل کو ٹھکرا کر اب ایک وحدہٗ لاشریک لہ کی امان میں آجاؤ کامیاب ہوجاؤ گے، اتنا کہنا تھا قریش چیں بہ جبیں ہوگئے، بپھر گئے، مسلمانوں کے ساتھ تشدد و زیادتی پر اتر آئے، جوں جوں مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا قریش کی عداوت کی آگ مزید سلگتی، مسلمانوں کو اب باغی و صابی سمجھا جانے لگا، ان کمزور و بے سہارا مسلمانوں کے خون کو حلال سمجھا جانے لگا، ان کے لیے کوئی ایسا نہ تھا جو ان پر ہونے والے ظلم کو روک دے۔

ایسی صورت حال میں ہی حضرت عمار بن یاسر اور ان کے والدین نے اسلام قبول کیا، مشرکین مکہ دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں تپتی ریت پر ان کو گھسیٹتے، طرح طرح کے عذاب

دیتے، حتی کہ یا سراًسی عذاب میں جو مشرکین مکہ کی جانب سے روا رکھے گئے تھے انتقال فرما گئے، اور دیگر تمام اصحاب رسول کو ایسی سزاؤں سے گزارا گیا جن کو بیان کرنے سے ہی انسان لرز کر رہ جائے، جسم و جان پر رعشہ طاری ہو جائے۔ اسی پر بس نہیں، بات نبی عربی کی ناموس و عزت تک پہنچی، نبی عربی کے خلاف تمسخر و بدتمیزی طوفان کھڑا کر دیا گیا کوئی شاعر کہتا، کوئی پاگل سمجھتا، کوئی کاہن کہتا، کوئی جادوگر بتاتا۔

مزید برآں مختلف مقامات سے حج یا دیگر اغراض کے لیے مکہ آنے والے قافلوں کا قریش نے بڑھ بڑھ کے استقبال کرنا شروع کر دیا، نبی عربیؐ کے خلاف ان قافلوں کو بھڑکایا جاتا، تاکہ محمد عربی کی محبت ان کے دل میں بیٹھنے نہ پائے، بلکہ وحشت و نفرت ہو جائے، بدگمانیاں دماغوں میں بیٹھ جائیں، ورغلانا شروع کر دیا لیکن آپ بھی دیوانہ وار، مجمعوں، مجلسوں، محفلوں میں جاتے رہے، میلوں ٹھیلوں میں جاتے رہے، آپ کی ایک ہی دھن تھی، ایک ہی رٹ تھی، لوگوں کلمہ پڑھ لو کامیاب ہو جاؤ گے۔

ادھر قریش کے عداوت بڑھتی ہی جا رہی تھی، پریشانیوں میں اضافہ ہی ہو رہا تھا، اللہ کے رسول اور آپ کے اصحاب نے پھر حبشہ کی طرف ہجرت کی، آپ کا بائیکاٹ کیا گیا کہ محمد عربی سے کوئی لین دین نہ کرے، ان سے تعلق نہ رکھے، جوف کعبہ میں لکھ کر معلق کر دیا گیا، آپ شعب ابی طالب میں محصور ہونے پر مجبور ہو گئے، آپ کا حقہ پانی بند کر دیا گیا، کھانا کپڑا روک لیا گیا، آپ کو محصور رہنا پڑا، جو دشمنوں کے بس میں تھا وہ سب کر گزرے، ترکش کے سارے تیر چلا دیئے، مسلمان پھر بھی الٰہی مشن کی خاطر ان سب آزمائشوں کو جھیلتے رہے۔

بیعت عقبہ اولیٰ:

نبوت کے گیارہویں سال حضرت سوید بن صامت حج کے ارادہ سے مکہ روانہ ہوئے، حضور پاکؐ سے ان کی ملاقات ہوئی، آپ نے دعوت اسلام پیش کی، جس کو سن کر سوید بن صامت کو کہنا پڑا، ''کتنی اچھی بات ہے'' کتنا اچھا جملہ ہے، انھوں نے مدینہ جا کر اپنی قوم کو دینی تعلیمات پیش کیں جو آپ نبی عربی سے سن کر آئے تھے، لیکن افسوس وہ اوس و خزرج کے درمیان چھڑنے والی جنگ میں بعات کے مقام پر قتل کر دیے گئے۔

پھر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم موسم حج میں مختلف قبائل کو دعوت اسلام کو پیش کرنے کی فہم شروع کی، آپ کی ملاقات قبیلہ خزرج کے لوگوں سے ہوئی ہے، آپ نے ان کو دعوت اسلام پیش کی، انھوں نے نہ صرف اس کو قبول کیا بلکہ تصدیق کی اور تبلیغ کی، مدینہ میں اس طرح اسلام کی کرنیں روشن ہوتی چلی گئیں۔

اگلے سال پھر زمانۂ حج میں بارہ افراد پر مشتمل وفد سے ملاقات ہوئی، بنیادی باتوں پر بیعت ہوئی، جنگ و جدال کی کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔

اس ایمانی اقرار کے اجزا یہ تھے:

''ہم اللہ کے ساتھ کس کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے، چوری نہیں کریں گے، زنا نہیں کریں گے، اپنے بچوں کو قتل نہیں کریں گے، کسی کے خلاف کوئی غلط بات منسوب نہیں کریں گے اور کسی بھی معاملہ میں نبی عربی کی نافرمانی نہیں کریں گے، اور جاہلانہ رسومات سے مکمل اجتناب کریں گے''۔

جب یہ بیعت ہوئی تو پیغمبر خدا نے مصعب بن عمیر بن ہاشم کو مدینہ منورہ میں فریضۂ دعوت پر مامور کیا، اوران کے اوپر ذمہ داری ڈالی کہ وہاں کے لوگوں کو جا کر قرآن کی تعلیم دیں، دین کی سوجھ بوجھ پیدا کریں، چنانچہ انھوں نے حکم کی تعمیل میں اسلامی تعلیمات لوگوں تک پہنچانی شروع کیں جس کے نتیجہ میں ایک خاصی تعداد مشرف بہ اسلام ہوئی، خارج مکہ حضورؐ کی یہ پہلی کامیابی تھی۔

اسلام کے پھریرے مدینہ میں پھر لہراتے چلے گئے، نبی عربیؐ کے پاس اب اتنی بڑی جماعت ہو چکی تھی جس پر تمام معاملات میں آپ اعتماد کر سکیں جو نہ صرف آپ کی باتوں کو نہ صرف تسلیم کرتی ہو بلکہ دوسروں تک اس کی حقانیت و صداقت

پیش کرنے کے لیے موزوں ہو۔

بیعت عقبہ ثانیہ:

جب اسلام مدینہ میں پھیل چکا تو مدینہ کے ستر سے زائد مسلمان فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے مکہ تشریف لائے، یہ اپنی قوم کے مشرک حاجیوں کے ساتھ شامل ہوکر آئے تھے، مکہ پہنچنے کے بعد یہی قافلہ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کی شکل میں قریش سے بچ بچا کر راتوں کی تاریکی ووحشتنا کی میں اپنے قائد سے جاملا، جس میں کچھ قبیلہ اوس اور کچھ افراد قبیلہ خزرج کے تھے، دوخواتین بھی اس میں شامل تھیں، نسیبہ بنت کعب ام عمارۃ، دوسری اسماء بنت عمرو بن عدی، سب جمع ہوکر نبی کا انتظار کرنے لگے پھر وہ مبارک ساعت بھی آئی جس میں آپؐ اور آپؐ کے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب تشریف لائے، آپ کے چچا اگرچہ ابھی تک مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے مگر اس کے باوجود وہ اطمینان چاہتے تھے، سب سے پہلے آپ کے چچا نے ہی گفتگو کی، پھر آپؐ نے، آپؐ نے پہلے تلاوت فرمائی، پھر اللہ کی طرف دعوت دی، دین اسلام کی ترغیب دی، اس کے بعد بیعت کا سلسلہ شروع ہوا، پھر آپ نے فرمایا میں تم سے اس بات پر بیعت لیتا ہوں کہ تم اس چیز سے میری حفاظت کرو گے جس سے اپنے بال بچوں کی حفاظت کرتے ہو، سب نے اس پر اتفاق کیا، آپ سے کہا گیا، ہم یقیناً اس چیز سے آپ کی حفاظت کریں گے، جس سے اپنے بال بچوں کی حفاظت کرتے ہیں، ہم نے آپ سے پختہ اور مکمل بیعت کی ہے، خدا کی قسم ہم جنگ کے عادی و دلدادہ ہیں، جنگ ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، ہتھیار کا استعمال ہمارے لیے بہت معمولی کام اور روز مرہ کا معمول ہے، ہماری شجاعت خاندانی ہے۔

بیعت مکمل ہوجانے کے بعد رسول اللہ نے تجویز رکھی کہ بارہ سرداروں اور نقباء کا انتخاب کرلیا جائے جو اپنی قوم کے سربراہ اور صاحب حیثیت ہوں، فوراً اس پر عمل کیا گیا حکم کی تعمیل کی گئی، بارہ نقیبوں کا انتخاب عمل میں آیا، تین قبیلہ اوس اور نو قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے، اس طرح آپ کی سربراہی میں مکہ کے باہر کارروائی کی ابتدا کردی گئی۔

معاہدہ اب مکمل ہوچکا تھا، لوگ پھیلنے ہی والے تھے کہ ایک مشرک کو اس بات کا پتہ چل گیا، اس نے گفتگو سن لی چونکہ وہ وہیں خیموں اور قناتوں کے ارد گرد چہل قدمی کے بہانے یہ گفتگو کو سن رہا تھا، فوراً اس نے ٹیلہ پر چڑھ کر نعرہ لگانا شروع کردیا، خیمے والو! دیکھو محمد عربی اور اس کے ساتھ جو صابی ہیں وہ تم پر حملہ کرنے کے لیے بالکل تیار ہیں، چونکہ اس کے پاس موقع اتنا نہیں تھا کہ قریش تک یہ خبر پہنچا دے اسی لیے اس نے چیخنا چلانا شروع کردیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ اس گھاٹی کا شیطان ہے، اے اللہ کے دشمن! اب میں تجھ سے مقابلہ کرنے والا ہوں، اس کے بعد آپؐ نے لوگوں سے مخاطب ہوکر کہا کہ وہ اپنے کجاووں کی طرف لوٹ جائیں۔

چنانچہ صبح ہوتے ہی ایک طاقتور وفد نے اس معاہدہ کی مخالفت میں احتجاج کی نیت سے اہل یثرب کے خیموں کا رخ کیا، اور عرض کیا:

کہ اے خزرجیوں! ہم کو خبر موصول ہوتی ہے کہ ہمارے صاحب (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہمارے درمیان سے نکال لے جانے کے لیے آئے ہو، اور ہمارے خلاف اس کے ہاتھ پر بیعت کررہے ہو حالانکہ عرب کا کوئی قبیلہ ایسا نہیں ہے جس سے جنگ کرنا ہمارے لیے اتنا زیادہ ناگوار ہو جتنا آپ حضرات سے ہے، لیکن خزرج کے مشرکوں کو اس بارے میں کچھ بھی علم نہیں تھا، اس لیے انھوں نے قسم کھا کر یقین دلانے کی کوشش کی کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اس طرح یہ بیعت عقبہ ثانیہ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری کامیابی تھی۔

ہجرت کی تیاری:

نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ کے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ اب اپنے بھائیوں کے پاس مدینہ چلے جائیں، حکم

کی تعمیل میں مسلمانوں نے اپنے ہر قسم کے مال ومنافع کھودیئے، بیوی بچوں تک کو قربان کردیا، سارے مفادات کو تج کر کے مدینہ کی طرف دیوانہ وار لپکے، سب کچھ داؤ پر لگا دیا، کسی کی بھی پراونہ کی، مشرکین نے مسلمانوں کے اس جوش وخروش کو دیکھا، تو ان میں کھلبلی سی مچ گئی، بڑے مضطرب ہوئے، ان کے سامنے اب بڑا چیلنج تھا، وثنیت وشنویت کو اب خطرہ ہو چلا تھا، قلق واضطراب بڑھتا ہی جارہا تھا، وہ اس مسئلہ پر غور وخوض کے لیے دارالندوہ میں جمع ہوئے، اس نئی صورت حال سے مقابلہ کے لیے ہر ایک نے اپنی اپنی تجویزیں رکھیں۔

بہرحال فیصلہ یہ ہوا کہ ہر قبیلہ کا ایک ایک مضبوط نوجوان لیا جائے، ہر ایک کو تلوار دے دی جائے، تاکہ وہ سب یکبارگی (نعوذ باللہ) محمد عربیؐ پر حملہ آور ہوجائیں اور کام تمام کردیں، ایسا اس لیے کیا گیا تاکہ سارا بوجھ اور الزام کسی ایک قبیلہ یا کسی شخصی واحد پر نہ آئے بلکہ تمام قبائل میں تقسیم ہوجائے، بنوعبد مناف تمام قبائل سے جنگ بھی نہیں کرسکیں گے، آخر کار دیت پر راضی ہونا پڑے گا، ہم سب مل کر دیت ادا کردیں گے۔ لیکن ادھر نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ناپاک سازش کا علم ہوگیا تھا، تفصیلات سے قطع نظر آپ نے اپنے محبوب ساتھی حضرت ابوبکر صدیق کو ساتھ لیا، اور مدینہ کی طرف روانہ ہوگئے، محفوظ ومامون مدینہ پہنچے، اہل مدینہ نے آپ کا بھرپور پرجوش استقبال کیا، آپ کا غیر معمولی استقبال ہوا، بچوں، بوڑھوں، عورتوں، لونڈیوں، بچیوں نے سب نے مل کر آپ کو خوش آمدید کیا، تہنیت ومبارکبادی کے نذرانے ملے، بلکہ آپ کے آمد مبارک سے پہلے ہی روزانہ بچے اور بچیاں آپ کے اشتیاق ودیدار میں سڑکوں وراستوں پر نکل آتیں، زوال کے وقت تک انتظار کرتیں، نبی عربیؐ کی ہجرت اس بات کی عکاس تھی کہ ایک عظیم قائد ورہنما اب اپنی فوج کے ساتھ محفوظ مرکز میں قیام پذیر ہوچکا ہے، یہ ہجرت گویا تحریک اسلامی کا پیش خیمہ اور تمہید تھی، اب باقاعدہ مدینہ اسلامی ریاست کا مرکز ومظہر بننے جارہا تھا، بلکہ تاریخ کا ایک سنہرا باب رقم ہونے جارہا تھا۔

مدینہ منورہ کے ابتدائی ایام:

مدینہ پہنچ کر ذرا سکون کی سانس لینے کے بعد آپ کو جو فکر لاحق ہوئی وہ تھی ایک مسجد کی تعمیر، اس کے قیام کا منصوبہ، اس کے لیے جگہ کا انتخاب کیا گیا، یتیم بچوں سے بامعاوضہ زمین خرید لی گئی، آپ نے اور آپ کے جان نثار صحابہ کرام کی مقدس جماعت نے تعمیری کام شروع کردیا، مسجد جستہ جستہ تعمیر ہوتی چلی گئی، یہ مسجد صرف برائے مسجد نہیں تھی بلکہ اسلامی تہذیب وتمدن کا گہوارہ تھی، مسائل کے حل کی جگہ تھی، مقدمات فیصل کرنے والی عدالت تھی، اسی کو میدان خطابت بننا تھا، اسی کو ایوان بننا تھا، یہیں سے اسلامی تعلیمات وہدایات کو عام کرنے والا قافلہ روانہ ہونا تھا، تو کیوں اس جوش وجذبہ سے سرشار ہوکر اس کی تعمیر وترقی میں حصہ نہ لیا جاتا۔

بھائی چارہ:

مدینہ میں آپؐ نے مہاجرین وانصار کے درمیان مواخات کا رشتہ قائم کیا، بھائی چارہ کرایا، آپ کے اس عمل کے نتیجہ میں ایسی مواخات کی نظیر دیکھنے میں آئی جس کی مثال ملنا مشکل ہے، انصار مہاجرین کے معاون ومددگار بنے کہ سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار کیونکہ مقصد ایک ہی تھا، اس لیے غیر واضح ہے وہ خود کی سب کے سب ایک ہوگئے تھے۔

اس کی ایک ادنیٰ سی نظیر حضرت سعد اور عبدالرحمٰن اس عملی نمونہ میں دیکھئے۔

حضرت سعد نے عبدالرحمٰن سے کہا:

میرے پاس مال کی فراوانی ہے، میں آدھا مال آپ کو دینے کے لیے تیار ہوں، اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں اپنی دو بیویوں میں سے ایک بیوی کو آپ کی خاطر طلاق دینے کیے لیے تیار ہوں کہ آپ نکاح کرسکیں، یہ ایک چھوٹی سی مثال تھی، اس سے بھی بڑھ کر انصار نے اس مواخات کو قرابت داری پر مقدم

رکھا، مواخات کو اہم سمجھا، اس بھائی چارہ اور اس مواخات نے گویا مسلمانوں کو یک جان دو قالب بنا دیا، بلکہ یوں کہئے کہ ایک ہی ذات میں گم کر دیا۔

غیر مسلموں کے ساتھ معاہدے:

نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف مسلمانوں کے درمیان عقیدے، سیاست اور وحدت نظام کے ذریعہ ایک نئے اسلامی ڈھانچہ کی بنیاد رکھی، وہیں دوسری طرف غیر مسلموں کے ساتھ بھی تعلقات کو منظم کرنے کی کامیاب کوشش کی، اس معاہدے میں آپ نے غیر مسلموں کے ساتھ جن تعلقات اور مسائل کو منظم و استوار کیا، ان میں قابل ذکر دو چیزیں ہیں، (۱) اجتماعی زندگی (۲) اقتصادی زندگی، معاشی اعتبار سے آپ نے ایسا نظام بنایا کہ ہر فقیر و غریب شخص کسی بھی مالدار شخص سے مدد حاصل کرے، اپنے معاشی وسائل کو مستحکم و مضبوط بنائے، تاکہ اپنے اوپر کسی فدیہ یا دین وغیرہ کے بوجھ سے بوجھل نہ پھرے، بلکہ باہمی مالی تعاون کے ذریعہ ان تمام مسائل سے بری ہو جائے۔

دوسری طرف سماجی و معاشرتی اعتبار سے آپ نے ایسی تعلیمات پیش کیں کہ پڑوسی کو پڑوسی کی حرمت و عزت سے متعارف کرایا، اہمیت بتلائی، ایسے اصول و قوانین سکھائے جو معاشرہ کی تعمیر کا سبب ہوں، جن سے ترقی ہو، دھوکہ، قتل و غارت گری، لوٹ کھسوٹ کی مذمت و شناعت بیان کی، آپ نے اس وقت کسی ایسے مسئلہ پر گفتگو نہیں فرمائی جو مختلف فیہ تھا، یا کسی چپقلش و ناچاقی کا موجب ہوتا۔

یہی دو وہ واضح پہلو تھے جن کو آپ نے نمایاں کرنے کی بھرپور کوشش کی، اور یہ بات معاہدہ میں ہوئی کہ مدینہ کے باہر سے کوئی بھی طاقت ور حملہ ہو، کسی کے اوپر ہو، سب ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہوں گے، اب سب کا مقصد اتحاد و اتفاق تھا کہ خارجی حملہ کے خلاف سب کو متحد ہو کر جواب دینا ہے، کوئی تفریق نہیں کرنی ہے۔ بڑی وضاحت کے ساتھ آپ نے یہ بات بھی رکھ دی کہ قریش اور اس کے معاونین کو پناہ نہیں دی جائے گی، جب تک مسلمان جنگ کی حالت میں رہیں گے یہود برابر مسلمانوں کے ساتھ مصارف میں برابر کے سہیم و شریک ہوں گے۔

اس معاہدے کے بعد مدینہ و اطراف مدینہ میں اسلامی ریاست اپنے قدم بڑھاتی چلی گئی جس کی سربراہی خود نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے۔

نتائج:

اب نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم اس پوزیشن میں آ گئے کہ اپنے لشکر کے ساتھ مدینہ میں داخل ہوں، اور اختلاف دین و مذہب کے باوجود اہل مدینہ کی صفوں میں اتحاد پیدا کر سکیں، لوگوں کو مشترک کلمہ پر جمع کر سکیں، ان کی ذہن سازی اس طرح کی جائے کہ خارجی کوئی بھی حملہ ہو، قضیہ ہو، اس کے خلاف سب کو مل کر محاذ آرائی کرنی ہے، اور مدینہ کا دفاع کرنا ہے۔

مسلمان اب بھی اقلیت میں تھے لیکن وہ جیش رسول تھے، رسول عربی نے اس طرح ان کی تربیت کی تھی کہ ان کے قلوب ایمان کی کھیتیوں سے لہلہا اٹھے تھے، حرارت ایمانی سے سینے لبریز تھے، اس نبوی طریقہ پر شجر کاری کے بعد ان کے دلوں میں یہ عقیدہ راسخ ہو گیا تھا کہ راہ اسلام میں آنے والی ہر اس چیز کے لیے اپنا سینہ پیش کر دینا ہے جو اس کے منافی ہو، جانوں کے نذرانے پیش کر دینے میں بھی دریغ نہیں کرنا ہے۔

اب ان کو ایک ہی دھن سوار تھی ''دفاع اسلام'' اور اشاعت اسلام کی آزادی، اس کے درمیان روڑا بننے والی ہر چیز کے ازالہ کے لیے انھوں نے ہر چھوٹی بڑی چیز کو داؤ پر لگا دینے کا عزم مصمم کر لیا تھا اس طرح آپ نے ایک بہترین و مثالی قائد کی شکل میں لوگوں کو ایک عقیدہ اور ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا، جس کے نتیجہ میں قلت اسباب کے باوجود مسلمان بفضل اللہ جنگوں اور معرکوں میں کامیابی حاصل کرتے چلے گئے۔

☆☆☆

❑ اصلاحیات

مسلمان! اغیار کی نقالی سے بچیں!

عبدالرشید طلحہ نعمانی

اللہ رب العزت نے اپنے آخری نبی محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ انسانیت کے نام جو آخری پیغام دیا ہے، اس کامل ومکمل، عالم گیر وانقلاب آفریں پیغام کا نام دینِ اسلام ہے؛ جو زندگی کے تمام شعبہ جات کا احاطہ کرتا ہے اور جس میں حبہ برابر کمی پیشی کی گنجائش نہیں۔ یہ وہ پاکیزہ دین ہے، جس کی اپنی تہذیب وثقافت ہے، اپنی شناخت وپہچان ہے، اپنی معاشرت وسوسائٹی ہے۔ جس طرح ایک مسلمان، مسلمان ہونے کی حیثیت سے عقائد وعبادات میں دینِ اسلام کا پابند ہے، بالکل اسی طرح اجتماعی وتمدنی زندگی میں بھی اسلامی حدود کی رعایت و پاس داری اس کا اولین فریضہ ہے۔ یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے اور خود تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جب تک مسلمان اپنی زندگی میں اِس دین اور اس کی آفاقی تعلیمات پر عمل پیرا رہے اور کتاب وسنت کو مضبوطی سے تھامے رکھا، تب تک وہ دنیاوی اعتبار سے ترقی کی راہوں پر گامزن رہے اور ہزاروں سال تک کائنات ارضی کے ایک بڑے حصے پر پورے آب وتاب کے ساتھ حکومت کرتے رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا کی دیگر قومیں، مسلمانوں کی نقالی کرنے میں اپنے لیے فخر محسوس کرتی تھیں اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے الفاظ میں یہ صورت حال تھی کہ مسلمان مؤثر تھے اور باقی اقوام متاثر تھیں۔ مگر جب بدعملی، ناخواندگی اور اسباب عیش وعشرت کی فراوانی کے سبب ہر طرف پستی وادبار کی گھٹائیں چھا گئیں تو عروج وسربلندی کا ماہِ درخشاں گھنے بادلوں میں روپوش ہوگیا پھر مسلمانوں کی اکثریت دین بیزار وغفلت شعار ہوئی اور اپنے تہذیبی ورثے کی حفاظت نہ کرسکی۔

گنوادی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

ایک افسوس ناک واقعہ:

رواں ماہ سوشل میڈیا پر ایک ہفتہ قبل ایک ویڈیو وائرل ہوا؛ جس میں یہ بتایا گیا کہ کچھ برقعہ پوش مسلم خواتین اور اسلامی لباس میں ملبوس کم سن طالبات پوری فرحت وشادانی کے احساس کے ساتھ غیر مسلموں کے مذہبی مراسم یعنی پوجا پاٹ اور رقص وناچ میں نہ صرف شریک ہیں؛ بل کہ ان کے شانہ بہ شانہ وہ تمام امور انجام دے رہی ہیں جو خالص ہندو مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس واقعہ کا حقائق کی دنیا سے کتنا تعلق ہے وہ تو اللہ علیم وخبیر جانتا ہے؛ مگر یہاں اس بات کا اندیشہ بالکل بجا ہے کہ جہالت وبے علمی اور اغیار کے ساتھ اختلاط ومیل جول کے سبب ظاہری آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں معاذ اللہ کہیں وہ سچ تو نہیں۔

اگر ہے تو پھر ہمیں اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیے، اپنے اعمال کا جائزہ لینا چاہیے اور منظّم منصوبہ بندی کے ساتھ تشبہ بالکفار کے اس فتنہ کا مقابلہ کرنا چاہیے؛ تاکہ اگلی نسلیں جہالت کی تاریکی سے نکل کر علم کی روشنی میں آسکیں اور اسلامی تہذیب وثقافت کی حفاظت وصیانت کے فریضہ انجام دے سکیں۔

تشبہ بالکفار؛اقسام واحکام:

شریعت مطہرہ کی رُو سے چار قسم کے امور میں کفار کی مشابہت سے روکا گیا ہے۔ جو حسب ذیل ہیں:

1: معتقدات یعنی عقائد میں کفار کے ساتھ مشابہت۔

2: عبادات یعنی عبادت وبندگی میں ان کے طریقے کی پیروی۔

3: جشن وتہوار یعنی خوشی منانے اور مسرت کا اظہار کرنے میں ان کی نقالی۔

4: عادات واطوار یعنی ہیئت کذائی، ظاہری شکل وصورت، لباس وپوشاک اور عادات واخلاق میں ان کی موافقت۔

حضرت حکیم الامتؒ نے ہر ایک کا الگ الگ حکم بھی بیان فرمایا ہے؛ جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

(1) تشبہ بالکفار، اعتقادات وعبادات میں کفر ہے اور مذہبی رسومات میں حرام ہے، جیسا کہ نصاریٰ کی طرح سینہ پر صلیب لٹکانا اور ہنود کی طرح زُنّار باندھنا، ایسا تشبہ بلاشبہ حرام ہے۔ تشبہ بالکفار امور مذہبیہ میں حرام ہے جو چیزیں دوسری قوموں کی مذہبی وضع ہیں ان کا اختیار کرنا کفر ہوگا جیسے صلیب لٹکانا، سر پر چوٹی رکھنا ''یا جے'' پکارنا۔

(2) معاشرت، عبادات اور قومی شعار میں تشبہ مکروہ تحریمی ہے مثلاً کسی قوم کا وہ مخصوص لباس استعمال کرنا جو خاص انہی کی طرف منسوب ہو، اور اس کا استعمال کرنے والا اسی قوم کا ایک فرد سمجھا جانے لگے جیسے نصرانی ٹوپی اور ہندوانہ دھوتی، یہ سب ناجائز اور ممنوع ہے اور تشبہ میں داخل ہے۔

(3) اور جو چیزیں دوسری قوموں کی نہ قومی وضع ہیں نہ مذہبی، گو ان کی ایجاد ہوں اور عام ضرورت کی چیزیں ہیں جیسے دیا سلائی یا گھڑی یا نئے ہتھیار یا نئی ورزشیں جن کا بدل ہماری قوم میں نہ ہو اس کا برتنا جائز ہے؛ مگر ان جائز چیزوں کی تفصیل اپنی عقل سے نہ کریں بلکہ علماء سے پوچھ لیں۔ ایجادات وانتظامات اور اسلحہ اور سامانِ جنگ میں غیر قوموں کے طریقے لے لینا جائز ہے جیسے بندوق ہوائی جہاز وغیرہ یہ درحقیقت تشبہ نہیں مگر شرط یہ ہے کہ اس کے استعمال سے نیت وارادہ کافروں کی مشابہت کا نہ ہو، یہ ان ایجادات کا حکم ہے جن کا بدل مسلمانوں کے پاس نہیں اور جو ایسی ایجاد ہوں کہ جس کا بدل مسلمانوں کے پاس موجود ہو تو اس میں تشبہ مکروہ ہے۔

(4) مسلمانوں میں جو فاسق یا بدعتی ہیں ان کی وضع اختیار کرنا بھی گناہ ہے پھر ان سب ناجائز وضعوں میں اگر پوری وضع بنائی تو زیادہ گناہ ہوگا اور اگر ادھوری بنائی تو اس سے کم ہوگا۔ (ملخص از انفاسِ عیسیٰ)

تشبہ بالکفار کے نقصانات:

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے اپنی مایہ ناز کتاب ''اقتضاء الصراط المستقیم'' میں اس مسئلے پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں: غیروں کی مشابہت اختیار کرنے میں بہت سے نقصانات ہیں، ہم اختصار کے ساتھ ذیل میں چند کا ذکر کرتے ہیں:

(1) کفر اور اسلام میں ظاہری طور پر کوئی امتیاز باقی نہ رہے گا اور حق مذہب یعنی اسلام دیگر مذاہب باطلہ کے ساتھ بالکل مل جائے گا۔

(2) غیروں کی معاشرت، تمدن اور لباس اختیار کرنا درحقیقت

ان کی سیادت اور برتری تسلیم کرنے کے مترادف ہے، نیز اپنی کم تری اور کہتری اور تابع ہونے کا اقرار واعلان کرنا ہے اور مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے تمام اقوام پر برتری عطا فرمائی ہے اور پوری دنیا کا حکمران اور معلم بنایا ہے، حاکم اپنے محکوم کی تقلید کیوں کر کرسکتا ہے۔

(3) غیروں سے مشابہت اختیار کرنے سے ان کے ساتھ محبت پیدا ہوتی ہے؛ جب کہ اسلام میں غیروں سے دلی محبت صراحۃً ممنوع قرار دی گئی ہے۔

(4) آہستہ آہستہ ایسا شخص اسلامی تمدن کا استہزاء اور تمسخر کرنے لگتا ہے، ظاہر ہے کہ اسلامی تمدن کو اگر اہمیت دیتا اور اسے حقیر نہ سمجھتا تو غیروں کے تمدن کو اختیار ہی نہ کرتا۔

(5) جب اسلامی وضع کو چھوڑ کر اغیار کی وضع اختیار کرے گا تو قوم میں اس کی عزت باقی نہ رہے گی، ویسے بھی نقل اتارنے والا خوشامدی کہلاتا ہے۔

(6) دعویٰ اسلام کا، مگر لباس، کھانا پینا، معاشرت، تمدن، زبان اور طرز زندگی یہ سب کام اسلام کے دشمنوں جیسے اختیار کرنے کا معاذ اللہ یہ مطلب نکلتا ہے کہ لاؤ! ہم بھی غیر مسلم بنیں اگر چہ صورت ہی میں سہی۔

(7) دوسری قوموں کا طرز زندگی اختیار کرنا اسلام اور اپنی مسلم قوم سے بے تعلقی کی دلیل ہے۔

(8) غیروں کی مشابہت اختیار کرنا غیرت اور حمیت کے خلاف ہے۔

(9) غیروں کی مشابہت اختیار کرنے والوں کے لئے اسلامی احکام جاری کرنے میں دشواریاں پیش آتی ہیں، مسلمان اس کی شکل وصورت دیکھ کر گمان کرتے ہیں کہ یہ کوئی یہودی یا عیسائی یا ہندو ہے۔ سلام جیسی پیاری دعا سے محروم رہتا ہے، دنیا میں اس کی گواہی بھی تسلیم نہیں کی جاتی، اگر کوئی لاش، کافر نما مسلمان کی مل جاتی ہے تو تردد ہوتا ہے کہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے یا نہ پڑھی جائے اور اس کو کس قبرستان میں دفن کیا جائے۔

(10) جو لوگ غیروں کے معاشرے کو اپنا محبوب معاشرہ بناتے ہیں وہ ہمیشہ ذلیل وخوار رہتے ہیں، کیوں کہ عشق ومحبت کی بنیاد تذلیل پر ہے یعنی عاشق کو ہمیشہ اپنے معشوق کے سامنے ذلیل وخوار بن کر رہنا پڑتا ہے۔ (بحوالہ کلمۂ حق از مولانا منصور احمد)

آتش بازی ایک غیر اسلامی تہوار:

ان دنوں برادران وطن کے ایک اہم تہوار ''دیوالی'' کی تیاریاں عروج پر ہیں اور مسلم بچوں اور نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد بھی اس سلسلہ میں کافی سرگرم نظر آرہی ہے حالاں کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق آتش بازی حرام ہے؛ اس لیے کہ اس کی بنیاد ان عقائد وافکار پر ہے جو خالص مشرکانہ اور دیوی دیوتاؤں سے وابستہ ہے۔ دیوالی کے دنوں میں لکشمی کے بُت کی پوجا دیوالی کی تقریب کا ایک اہم حصّہ ہے۔ جن لوگوں کا یہ عقیدہ ہے، وہ کیک کاٹیں، یا دیئے جلائیں۔ یہ ان کے مذہب کا حصہ ہے؛ لیکن جو مسلمان توحید کا عقیدہ رکھتا ہو، اور لا الہ الا اللہ پر ایمان اس کی شناخت کا لازمی حصہ ہو، اس کے لئے اس عقیدے کے عملی مظاہرے کا حصہ بننا ہرگز روا نہیں؛ کیوں کہ جب مسلمان دیگر اقوام کے تہواروں کو اپنا 'قومی تہوار' سمجھ کر منانا شروع کردیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کی جدید نسل کی، اسلامی تہواروں (عیدین) سے جذباتی وابستگی ماند پڑ جاتی ہے اور ان کا تہوار منانے کا فلسفہ ہی بدل جاتا ہے۔ ان سب کے باوجود اگر کوئی اس میں حصہ لیتا ہے تو یہ دین میں مداہنت اور اپنے عقیدے کی کمزوری کا اظہار ہے۔

☆☆☆

تعارف وتبصرہ

نام کتاب: پیام سیرت
مصنف: محمد فرید حبیب ندوی
مبصر: نایاب حسن قاسمی

نبی اکرم ﷺ کی سیرت وسوانح ایک ایسا تروتازہ وشاداب موضوع ہے کہ جس پر اب تک دنیا بھر کی سیکڑوں زبانوں میں ہزار ہا کتابیں لکھی گئیں، مگر اس کی تازگی وشگفتگی اب تک قائم ہے اور لکھنے والوں کو ان کے ظرف وذہن کے مطابق کوئی نہ کوئی ایسا پہلو نظر آ ہی جاتا ہے، جس میں جدت، لطافت اور حسن وکشش کا ایسا وصف پایا جاتا ہے جو انھیں قلم اٹھانے پر مجبور کرتا اور پھر وہ اپنے مطالعے کی وسعت، مشاہدے کی قوت، تخیل کی توانائی اور حبِ نبوی ﷺ کی گہرائی وگیرائی کے زیر اثر اس مبارک موضوع پر خامہ فرسائی کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ لگ بھگ ڈیڑھ ہزار سال کے عرصے میں نہ معلوم دنیا کی کتنی زبانوں میں سیرت نبوی کے کن کن پہلوؤں پر کیسے کیسے عظیم اصحابِ قلم نے کتابیں لکھیں اور اب تک اس کا سلسلہ جاری وساری ہے۔ اردو زبان گرچہ دنیا کی بہت زیادہ قدیم زبان نہیں ہے، مگر اس کے باوجود اس زبان میں سیرتِ پاک کے موضوع پر دنیا کی بہترین کتابیں لکھی کی گئی ہیں، چاہے وہ مفصل ہوں یا مختصر، منظوم ہوں یا منثور، منقوط ہوں یا غیر منقوط، شمائلِ نبوی ﷺ پر مشتمل ہوں یا آپؐ کے خانوادۂ پاک کے حالات وسوانح پر مشتمل ہوں، الغرض اردو زبان کا دامن بھی سیرت النبی ﷺ کے حوالے سے مالا مال ہے، اس کے علاوہ مختلف زبانوں میں لکھی گئی سیرت کی اچھی کتابوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔

حالیہ دنوں میں سیرتِ پاک کے موضوع پر اردو زبان میں ایک قدرے مختصر، مگر نہایت پر لطف کتاب ''پیامِ سیرت'' کے نام سے آئی ہے۔ کتاب کے مؤلف مولانا فرید حبیب ندوی ہیں، امام بخاری ریسرچ اکیڈمی علی گڑھ سے شائع ہوئی ہے۔ یہ باضابطہ سیرت کی کتاب نہیں ہے، اس میں مختلف اہم واقعاتِ سیرت کو مؤلف نے اپنے اسلوب میں بیان کیا ہے، ان کا یہ اسلوب نہایت دلچسپ، خوب صورت اور دلکش ہے، ایسا اسلوب ہے، جو اکتسابی نہیں ہوتا، اس کا محرک کوئی بہت قوی وتوانا جذبہ ہوتا ہے، جو صاحبِ قلم کے دل ودماغ میں سرشاری پیدا کرتا اور اسی کے زیر اثر وہ لکھتا چلا جاتا ہے، فرید حبیب صاحب کا یہ اسلوب بھی عشقِ مصطفوی ﷺ کے جذبۂ فراواں کا عکاس ہے، یہ پوری کتاب فرید حبیب صاحب کے عشقِ رسول ﷺ کی منھ بولتی تصویر ہے، انھوں نے سیرت نبوی ﷺ کے اہم ترین واقعات کو جس پرکشش انداز میں بیان کیا ہے، اس کی وجہ سے وہ واقعات بارہا پڑھے ہوئے ہونے کے باوجود نئے نئے سے لگتے ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم سیرت کے اس پہلو سے پہلی بار آشنا ہو رہے ہیں یا ہم یہ واقعہ پہلی بار پڑھ رہے ہیں۔ انھوں نے یہ کتاب عشق وسرمستی میں ڈوب کر لکھی ہے اور اس کی ہر سطر ان کے اس عشق کی گواہی دے رہی ہے۔ اردو میں پہلے بھی سیرت پر اس طرز کی کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں مولانا مناظر احسن گیلانی کی ''النبی الخاتم'' اور مولانا عبدالماجد دریابادی کی ''ذکرِ رسول'' خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں، اسی طرح ماہر القادری کی ''درِ یتیم'' تو ناول کے انداز میں ہی لکھی گئی ہے، ان تینوں کتابوں کی اپنی خصوصیات ہیں اور اختصار کے باوجود سیرتِ پاک کو دلچسپ اور انوکھے انداز میں پیش کرتی ہیں۔ زبان وادب سے دلچسپی رکھنے والا طبقہ ایسے اسلوب کی طرف کھنچتا ہے اور آج بھی ان کتابوں کا مطالعہ ذوق وشوق سے کیا جاتا ہے۔ فرید حبیب صاحب کا اسلوب بھی کچھ ایسا ہی ہے، انھوں نے چھوٹے چھوٹے جملوں، خوب صورت تعبیرات، دلنشیں ترکیبات اور پرکیف وسرور بخش محاورات کا عمدہ استعمال کیا ہے۔ ان کا مقصد اس سے یہ ہے کہ قاری کے دل میں عشقِ رسول ﷺ کا وہ جذبۂ بے پناہ پیدا ہو جائے، جو اسے دارین میں سرخرو کر دے اور اسی مقصد سے انھوں نے قرنِ اول کے چیدہ چیدہ واقعات کی دل آگیں تصویر کشی کی ہے۔ کتاب دو سو صفحات پر مشتمل ہے، سیرت پاک سے دلچسپی رکھنے والے احباب اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں۔

☆☆☆